tan in Washington.
President
esident Ayub upon
y.



aceful solution of Indo-Pakistani
oth countries could get on with
mic and social development, and
rnments' mutual support for U.N.
olutions on Kashmir.

ssibility of peace and stability in
een discussed within the context of a

Washington, L

PRESIDE
have ha
tive talk
Ayub's visit
opportunity t
quaintance an
tive visits to
1961.

The two P
events in Sou
between Indi
they reaffirme
U.N. Securit
1965, in all
adopted on S

President
States regards
tion of the in
and expressed
States in Pak
ment. Presid
that Pakistan
relationship
the continuin
bute to this

The two
peaceful reso
between Indi
and resource
would not be

سُہیل کی سرگذشت

از

رشید احمد صدیقی
انچارج شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

نفیس اکیڈمی
عابد روڈ حیدرآباد دکن
قیمت چار روپیہ چار آنہ سکۂ عثمانیہ — قیمت تین روپیہ بارہ آنہ حالی

بار اوّل

شیخ نور حسین مالک کوہ نور بکڈپو نے
مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر گنپت روڈ
لاہور سے شائع کیا

~~ریاض احمد خان~~
۱۷ فروری ۵۸ء

فہرست

سہیل کی سرگذشت

نام سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہیں مسٹر سہیل دلچسپ نگری اور یہ کتاب ان کی سوانح عمری ہوگی۔ یا پھر یہ کتاب علم ہیئت یا علم نجوم کی کوئی کتاب ہوگی جس میں سہیل یمانی یا سہیل شامی جیسے کسی ستارے کے احوال اور اس کے اجسام ارضی پر اثرات بیان کئے گئے ہوں گے۔ لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب استاذ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے آج سے کوئی بیس سال پیشتر ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا تھا بنام "سہیل" اور یہ کتاب اسی رسالہ میں شائع شدہ شاہکاروں اور ادب پاروں کا مجموعہ ہے۔

وہ رسالہ بند ہوگیا، تھوڑے ہی دنوں میں بند ہوگیا۔ ادیب ہونا اور بات ہے اور کاروباری ہونا اور بات، ہماری زبان کے بہترین ادیبوں' اور ارباب قلم نے جو بہترین جرائد و رسائل جاری کئے ان میں سے 'معارف' 'جامعہ' اور رسالہ اُردو

کی طرح کے چند رسالوں کے علاوہ تقریباً سارے کے سارے ہی بند ہو گئے۔ بات یہ ہوتی ہے کہ یہ رسالے علمی و ادبی معیار سے جتنے مکمل ہوتے ہیں کاروباری اور تجارتی اعتبار سے اسی قدر نامکمل رہ جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چل نہیں پاتے۔

یہی حال ہوا رسالہ سہیل کا آسمان ادب پر چمکا اور ایسا چمکا کہ نظریں خیرہ ہو گئیں۔ لیکن تھوڑے دنوں میں غروب ہو گیا۔ اور ایسا غروب ہوا کہ پھر کہیں نشان نہ ملا جن آنکھوں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ بار بار اسے دوبارہ دیکھنے کے لیے اٹھتی رہیں اور آج تک اٹھ رہی ہیں۔ مگر مایوسی کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔

آج ہم اس کو نہیں اس کے بہترین شہپاروں کو دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ یہ پروفیسر رشید کے قلم سے نکلی ہوئی تحریریں ہیں۔ جس کے قلم کی شگفتگی اور بے ساختہ و پر لطف مزاح کی ساری اردو دنیا قائل ہے۔ پروفیسر رشید کا اردو ادب میں جو مقام ہے وہ اتنا واضح اس طرح بلند و نمایاں ہے کہ اس کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل کا درجہ رکھتا ہے۔

مخلص

۲۲ مارچ ۴۷ء

محمد اقبال سلیم گاہندری

تعارف

از جناب مفتی محمد انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی

ایک عالم و محقق کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک ادیبِ انشاء پرواز ہونے کے اعتبار سے **پروفیسر رشید احمد صدیقی** کا شمار مسلّمہ طور پر ہندوستان کے بہترین لکھنے والوں میں ہے ان کی ہر تحریر نہ صرف مخصوص اور اچھوتے طرز نگارش کی وجہ سے

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

کی مصداق ہے بلکہ ان کی مفکرانہ اور فلسفیانہ مضمون نگاری

"زندگی زندہ دلی کا نام ہے"

کا پیغام جاں فزا ہے۔

اس پیغام کی کامیاب اثر اندازی کے خود رشید صاحب بہترین مثال ہیں۔ ان کے صدہا شاگرد آلامِ روزگار یا گردشِ فلکِ کج رفتار کے ہاتھوں بدحال ہوگئے مگر رشید صاحب مسلم یونیورسٹی کی مستقل ملازمت، کثیر العیالی اور آئے دن بڑے بڑے سخت امراض

کا شکار ہونے کے باوجود صوری و معنوی اعتبار سے خدا رکھے سدا بہار ہیں‘

رشید صاحب کی زندگی پر غور کرنے سے پہلے ان کے مرز بوم کا ذکر بھی ہو جائے تو بہتر ہے۔ ان کا وطن (مریاہو) مضافات جونپور سے ہے۔ جہاں کی خاک پاک سے ملا محمود صاحب شمس بازغہ اور مولانا اللہ داد و مولوی کرامت علی مبلغ اسلام جیسے کثیر التعداد حضرات پیدا ہوئے۔ رشید صاحب بھی اسی مردم خیز خطہ کے نامور فرزند ہیں آپ کے والد ماجد مولوی عبدالقدیر ابن شیخ رمضان علی خانوادہ شیوخ کے ایک ذی عزت فرد محترم ہیں۔

خاندانی حال آباو اجداد کا وطن مریاہو ہے۔ اسلاف الہ آباد کے ضلع سے ترک وطن کر کے یہاں آئے تھے

عبدالقدیر ابن رمضان علی ابن روشن علی ابن خدا بخش۔

پیشہ آبار ملازمت یا زمین داری خاندان شیخ‘ رشید صاحب کی نانہال سیدوں کا ہے جو بعد وہی ضلع مرزاپور میں محترم گردانے جاتے ہیں۔

شیخ رمضان علی صاحب نے اپنے دو لڑکوں کو جن میں سے عبدالقدیر صاحب‘ رشید صاحب کے والد بزرگوار اب تک بقید حیات ہیں مشرقی تعلیم سے پورے طور پہ بہرہ مند کرا کے پولیس کے محکمہ میں داخل کرایا۔ عبدالقدیر صاحب مدتوں اضلاع بلیا‘

غازی پور اور جونپور میں سب انسپکٹر رہے۔

پیدائش و تعلیم رشید صاحب کی عمر اس وقت پچاس کی ہو گی ابتدائی نوشت و خواند گھر کے مکتب خانہ میں ہوئی ہندی پاٹ شالہ میں نہیں! بلکہ شوالے میں پڑھی۔ متداول درسیات فارسی و عربی مولوی قدرت اللہ اعظم گڈھی سے پڑھیں اس کے بعد جونپور گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا[1]

کالج میں داخلہ ؁۱۹۱۵ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڈھ کے فرسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ سالانہ امتحان میں اول آئے اسٹریچی ہال میں جو بورڈ ہے وہ آپ کے جونیر اسکالر کا انعام پانے کی دائمی شہادت ہے۔ زبان انگریزی میں اول آنے پر آپ کو "ٹارین میڈل" اور فارسی میں اول آنے پر ایک دوسرا انعام ملا۔ آپ یونین کے "آنریری سکریٹری" ٹینس کلب کے جنرل سکریٹری اور ڈائننگ ہال کے "فوڈ مانیٹر" تھے۔ بنگال۔ آسام برما وغیرہ ڈیوٹی ڈیپوٹیشن لے کر گئے اور نہایت کامیاب آئے ؁۲۰-۲۱ء میں "علی گڈھ منتھلی" جو اب "یونیورسٹی میگزین" ہو گیا ہے اس کے آپ اردو۔ انگریزی دونوں سیکشن کے آنریری ایڈیٹر رہے آپ کے زیر ادارت اس کو معراج نصیب ہوئی اور ہر جگہ مقبول

---

[1] مردم دیدہ از انتظام اللہ شہابی صفحہ ۱۲

ہوا اسی زمانہ میں ٹینس کلب کے وائس پریسیڈنٹ مقرر ہوئے حالانکہ یہ عہدہ ہمیشہ اسٹاف کے حصے میں آتا تھا۔ دو سال متواتر ٹینس کے چمپین رہے۔ یہ تمام وہ خصوصیات ہیں جو عام طور پر کسی ایک طالب علم میں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں سکینڈ ڈویژن میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

ملازمت

آپ اول انٹر کالج میں اردو اور فارسی کے لکچرر ہوئے پھر مسلم یونیورسٹی میں لکچرر مقرر کئے گئے یونیورسٹی نے انتہائی چھان بین کے بعد آپ کو یہ عہدہ دیا اور بجائے ایک سال کے پروبیشن کے کامل دو سال آپ کے کام کی جانچ کی گئی کیونکہ اس وقت اردو کے لکچرار کا تقرر بالکل نئی بات تھی[١]

"اپنی یاد میں" ریڈیو پر فرماتے ہیں۔

مجھے اوائل طالب علمی میں زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ فراز کم، نشیب زیادہ۔ فارسی بہت کچھ اور عربی تھوڑی بہت گھر پر پڑھ کر میں انگریزی اسکول میں داخل ہوا۔ سالہاسال اسکول اور چھ سال تک علی گڈھ کالج کے بورڈنگ ہاوس میں رہا۔ میں نے انٹرنس پاس کرتے ہی کلرکی کر لی تھی جب کالج میں چھٹیاں ہوتی تھیں

---

[١] "سرگذشت" اولڈ بوائے نمبر

تو کلرکی پر چلا جاتا تھا اور چھٹیاں ختم ہوتیں تو کالج چلا آتا۔ اس طور پر پانچ سال گزرے۔ مجھے دیوانی کی گشتی عدالتوں میں کلرکی کرکے بہت سے مقامات اور عجیب و غریب انسانی کاروبار کے عجیب و غریب تجربات حاصل ہوئے۔ جو بجائے خود ایک مستقل داستان ہے۔ ایک بار دو مہینہ کے اندر اندر ایک طرف مسٹر بچی نالڈ کریڈک گورنر برما سے گورنمنٹ ہاؤس میں علی گڈھ کے حالات و حوادثات بالخصوص علی برادران کی حمایت میں تیز و تند گفتگو کی، دوسری طرف بنارس کی عدالت دیوانی میں فرش پر بیٹھ کر شام تک مسلسل نقل کی ہے اور ہیڈ کلرک اور منصرم کی جھڑکیاں اور چپراسیوں کی بے اعتنائیاں اٹھائی ہیں۔ تیسری طرف علی گڈھ میں آکر ٹینس کے معرکتہ الآرا میچ اور معرکتہ الآرا ترپونین کے الیکشن جیتے ہیں۔

اسکول میں کرکٹ، ہاکی، فٹ بال کا کپتان رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ علی گڈھ مجھے کھیلنے کا شوق لایا لیکن میں آیا ایسی ناکسی اور بے بسی کے عالم میں تھا اور وہ زمانہ علی گڈھ اور علی گڈھ والوں کی ایسی تمکنت و جلال

سکا تھا کہ کرکٹ، ہاکی فٹ بال میں میرا کوئی پرسانِ حال نہ ہوا ناچار میں نے ٹینس سیکھنی شروع کی اور کچی بارک (عثمانیہ) میں چارپائی ٹینس کلب کا خود رو ممبر ہو گیا۔ جال کے بجائے چارپائی کھڑی کر لی جاتی تھی اور کچی بارک کے سامنے ریت سے اٹے ہوئے میدان پر لوٹے سے پانی ڈال کر کورٹ بنا لیا جاتا تھا۔ ممبر ہر وہ شخص ہو سکتا تھا جس کے پاس چارپائی اور سکنڈ ہینڈ گیند ہو۔ آنریری ممبر وہ ہو سکتے تھے جو بیت الخلا جس کا نام اُن زمانہ میں "برسرِ آفس" بھی تھا جاتے اور وہاں سے آتے وقت کورٹ کی مٹی اور روندی ہوئی لائن پر پانی ڈال کر اسے پھر سے نمایاں کر دیں فرسٹ ایر میں ڈیوٹی سوسائٹی کے وفد کے ساتھ مشرقی بنگال، چٹا گانگ اور برما کا دورہ کیا۔ بی اے میں علی گڈھ میگزین کا ایڈیٹر اور ٹینس کا جنرل سکرٹری ہوا۔ ففتھ ایر میں یونین کا سکرٹری اور ایم اے پاس کرتے ہی ٹینس کا پریسیڈنٹ اور اردو کا لکچرار ہو گیا۔"

بورڈنگ لائف کا ٹھپہ میری بقیہ زندگی پر نمایاں رہا یعنی سپاہی اور قلندر کی زندگی آسودہ حال ہونے کے

باوجود جب میں علی گڈھ کی اصطلاح میں کافی عیّاشی کرسکتا تھا۔ دیو جانس کلبی کی طرح ایک ہی مختصر کمرے میں پورا مکان اور اپنی ضروریات کا تمام سامان سموئے رکھتا تھا۔ سونے کا کمرہ، پڑھنے کا کمرہ، مہمان کا کمرہ۔ ملاقات کا کمرہ۔ کھانے کا کمرہ۔ لباس کا کمرہ۔ غسل خانہ۔ بساط خانہ۔ غرض ہر گفتنی و ناگفتنی، شدنی و ناشدنی امور کا جائے وقوع جغرافیائی اعتبار سے ایک ہی تھا۔ چنانچہ میں مہمان کی حیثیت کہیں جاتا اور میزبان میری پذیرائی اور طعام و قیام میں اہتمام کرتا، یا تکلف برتتا تو مجھے بڑی وحشت اور ذہنی تکلیف ہوتی تھی، ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں کسی کا مہمان شاید ہی ہوتا۔

گزشتہ ۲۸-۲۹ سال میں علی گڈھ کا کوئی انقلاب ایسا نہ تھا جس میں بحیثیت طالب علم یا ممبر اسٹاف نہ گزرا ہوں۔ میری زندگی کا سب سے وقیع حصہ علی گڈھ اور علی گڈھ کے لئے صرف ہوا۔ میں نے یہاں شہرت حاصل کی اور آسودگی پائی۔ علی گڈھ کی فیض بخشیوں نے مجھے دوسرے کے فیض سے بے نیاز کر دیا۔ علی گڈھ

میری زندگی میری شخصیت اور میری تحریر میں جاری وساری رہا۔

- مجھے اچھے کھانے اچھا پہننے اور راحت کی زندگی پسند نہ تھی یہ باتیں دراصل عورتوں اور بچوں کو زیب دیتی ہیں۔ میں سب سے کم وقت کھانا کھانے۔ کپڑا پہننے منہ ہاتھ دھونے، حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے۔ یا سفر کے لئے آمادہ ہو جانے میں لیتا تھا۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ دل میں خوشی اور خلوص ہو تو رسمی تکلفات بے معنی ہیں۔ مجھے اپنے اوپر وقت، دولت، راحت اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں صرف کرنا بڑا شاق ہوتا تھا۔ لیکن مجھے یہ چیزیں بجائے خود ناپسند نہ تھیں۔ مجھے ہر پسندیدہ چیز پسند تھی۔ البتہ میں اس کے درپے رہتا تھا کہ اپنے بجائے ان کا فائدہ دوسروں کو پہونچاؤں۔

- مجھے زندگی میں ایک چیز کی بڑی تمنا رہی جو میرے اطمینان کے مطابق پوری نہ ہوئی۔ یعنی یا تو میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ میں حاجت مند کی اپنے اطمینان کے مطابق مدد کر سکتا یا میرا کوئی ایسا دولتمند

دوست ہوتا کہ جب کبھی اس قسم کی ضرورت پیش آتی تو وہ میری خاطر اور مجھ پر بھروسہ کر کے اسے پورا کر دیتا۔ میں خدا کی ناشکری نہ کروں گا اس بارۂ خاص میں میرے دوستوں ہی نے نہیں بلکہ میری تحریک پر بعض اجنبیوں نے غیر متوقع مدد کی۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ میری تمنّا اس حد تک پوری نہ ہوئی جس حد تک میں اُسے پوری دیکھنا چاہتا تھا۔

علی گڈھ میں آکر میری عادت ہو گئی تھی کہ ہر کام خواہ کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو اُس وقت کیا جائے جب اس کام کا وقت بالکل ہی گزر جانے پر آگیا ہو۔ کام ہمیشہ وقت ہی پر ہو کر رہا لیکن اس کے لئے جس بے تکی و بے پناہ جد و جہد کو بروئے کار لانا پڑتا اُس سے عہدہ برآ ہونے کا احساس بھی بڑے مزے کا ہوتا اس سے مجھ میں وہ اعتماد پھر عود کر آتا جس کو میں کسی نہ کسی وجہ سے کھو چکا ہوتا تھا اس سے میں اپنے آپ میں نوجوانوں کا سا حوصلہ اور تب وتاب محسوس کرنے لگتا۔ یہ وہ خود فریبی تھی جس نے مجھے دنیا کے تمام آلام و مصائب کے مقابلہ میں متعد

اور مگن رکھا۔

میں کام اس وقت زیادہ کرتا تھا جب فرصت کم ہو موسم خراب ہو اور طبیعت بھی اچھی نہ ہو۔ ایسے مواقع پر کام میں لگ جانا یوں مفید ہوتا کہ میرا ذہن اس تکلیف اور نامساعد حالات کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا تھا۔ کام کرنا وہ نشہ ہے جس میں نہایت آسانی سے ہر قسم کے مصائب غرق کئے جا سکتے ہیں۔

جب موسم خوش گوار ہوتا اور طبیعت بحال ہوتی تو مجھے کام کرنا مطلق پسند نہ تھا۔ میری لغت میں تعطیل منانے کے یہ معنے تھے کہ کسی کو مزے کا خط لکھا جائے گھر سے باہر قدم نہ نکالا جائے باغ میں کام کیا جائے گھر کی صفائی کی جائے ایک آدھ وقت کا کھانا ترک کر دیا جائے یا دو چار وقت کا کھا لیا جائے، بیوی بچوں کو بھی کوئی کام نہ کرنے دیا جائے جو ملنے آئے اُس سے طرح طرح سے بچا جائے۔ غسل کرنے کا اہتمام کیا جائے اور صرف ہاتھ پاؤں کو جھاڑ پونچھ لینے پر اکتفا کیا جائے۔

"بڑا قرض لیکر چھوٹے چھوٹے قرض دینے اور اس کے

ادا کرنے کی بے حد خوشی ہوتی تھی۔ میں قرض کو فنونِ لطیفہ میں سے سمجھتا تھا۔ کب لیا جائے، کس سے لیا جائے، کس طرح لیا جائے۔ اُس سے دوستی بڑھائی اور دشمنی گھٹائی کس طرح جا سکتی ہے۔ میرے ایک دوست اکثر بے وجہ مجھ سے خفا اور اپنی بیوی کی طرف سے مغموم ہو جایا کرتے تھے چنانچہ جب کبھی میں اُن کو ایسی حالت میں پاتا فوراً کسی بہانہ سے قرض مانگ بیٹھتا اور وہ یک لخت چونکتے اور چونچال ہو جاتے تھے۔"

"میں مسلمان پیدا ہوا۔ نہ میری پیدائش میں میرا کوئی دخل تھا اور نہ مسلمان ہونے میں۔ لیکن زندگی بھر جب مجھے ہر بات میں دخل تھا خودکشی بھی کر سکتا تھا اور اسلام سے بھی منحرف ہو سکتا تھا۔ میں نے زندگی اور اسلام دونوں کو ایک ہی بات سمجھا۔ ظاہر میں بھی۔ باطن میں بھی۔ مجھے اسلام کا پابند رہنے میں مرتے دم تک کبھی کوئی اہتمام نہ کرنا پڑا۔ بُری بات کو میں نے ہمیشہ بُرا سمجھا اور ہر اچھی بات میں اسلام کو معاون پایا۔ میں مسلمان پیدا نہ ہوا ہوتا تو بھی شاید مسلمان

ہی رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمان نہ کہلاتا۔ میں خدا سے سلوک کرنے پر ہمیشہ آمادہ رہا بغیر اس خیال کے کہ خود خدا میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اور بغیر اس بات کو ذہن میں لائے کہ خدا کا تصور مسلمانوں کا کہنا ہے یا کسی دوسرے کا کہنا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ حضرت رسالت مآب کا درجہ خدا نے کیا مقرر کیا تھا رسالت مآب کا تصور میرے ذہن میں ہمارے ہی جیسے ایک ایسے انسان کا تھا جس سے بڑے اور برگزیدہ انسان کا تصور میرے ذہن میں بھی کبھی نہ آیا میں کیا اور میرا تصور کیا لیکن میرے لئے تو یہ سب کچھ ہے"

شریفانہ طور طریق رشید صاحب میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو اگلے لوگوں میں تھیں۔ حفظ مراتب بزرگوں کی صحبت سے لطف اندوز ہونا اور با وجودیکہ مخاطب شہہ دے رہا ہو مگر خود بے تکلف نہ ہونا یہی شرفاء کا دستور رہا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ راقم السطور اور مولانا محمد ابرار حسین صاحب فاروقی ازہری مولانا سید سلیمان اشرف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولوی رشید احمد صدیقی ایک مونڈھے پر اور مولانا ایک کرسی پر پاؤں اٹھا کر اور سمیٹ کر بیٹھے ہوئے

تھے۔ مولانا تقریر کر رہے تھے اور اس میں کہیں قدماء کے شعر تھے کہیں کوئی پر لطف لطیفہ مگر رشید صاحب اپنے مخصوص انداز متانت سے سنتے رہے۔ مولانا ابرار تو ہنس بھی دئے مگر رشید صاحب مسکرائے تک نہیں، یہ دیکھ کر مجھ پر بڑا اثر پڑا کہ انگریزی داں ہوتے ہوئے یہ شائستگی۔ فی الحقیقت یہ جو کچھ ہے خاندانی اثرات اور گھریلو تربیت کا ثمرہ ہے۔ رشید صاحب نے مولانا موصوف کے یہاں کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ گنجہائے گراں مایہ سے نقل کرتا ہوں:-

> مجھے خوب یاد ہے ایک دن دو منزلہ (مکان مولانا مرحوم) کے سامنے سے بڑی تیزی سے سائیکل سے گزر رہا تھا۔ مولانا سامنے چبوترے پر ٹہل رہے تھے فوراً پکارا۔ ذرا ٹھیرنا! میں رکا۔ سائیکل کو چبوترے سے لگا کر قریب آنا چاہتا تھا، فرمایا۔ نہیں۔ بھئی۔ نیچے ہی کھڑے رہو، ایک بات کہنی تھی، تمہارے یار اصغر (گونڈوی کا) اب کے الہ آباد کے سفر میں ساتھ ہو گیا تھا۔ کیا شعر کہا ہے:
>
> رند جو ظرف اٹھائیں وہی ساغر بن جائے
> جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

اس شعر کو اپنے خاص مترنم کسی قدر حزین لیکن پروقار لہجہ میں پڑھا۔ کہنے لگے رشید اس شعر کا کہنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ الٰہ آباد تک ساتھ رہا۔ بڑا کڑھا ہوا آدمی ہے اب کبھی آئیں تو ضرور لانا۔ اس شعر کی خوبی کی تفصیل پھر سناؤں گا۔ اس وقت جاؤ۔ خوش رہو۔"

رشید صاحب کا کسی کی زندگی لکھنے کا ڈھب بھی اچھوتا ہے۔ ان ہی مولانا کے حالات میں اپنے ایک سفر کا پر لطف قصہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"میری طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا' کالج کھلنے والا تھا' مرحوم وطن سے تشریف لا رہے تھے۔ میں الٰہ آباد میں ملا۔ مرحوم سکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے . . . . اسٹیشن پر مجھے دیکھا۔ بولے آجاؤ۔ کھانا کھایا جائے' میں نے کہا میں سکنڈ کلاس میں کیسے بیٹھوں' کہنے لگے۔ کھانا کھانے کے لئے ہر کلاس برابر ہے۔ کوئی پوچھے گا تو میں سمجھ لوں گا' تم تو آہی جاؤ۔ ایک انگریز بھی اس ڈبہ میں تھا اس کی طرف دیکھ کر میں نے کہا اور جو یہ "فورٹ ولیم" بیٹھا ہوا ہے۔ کہنے لگے۔ گھبراؤ نہیں' یار ہے' آجاؤ میں اندر گیا۔ انگریز نے مولانا کی طرف اس طرح دیکھا

جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مولانا کی تجویز سے اتفاق کرتا ہے"

سونے اور کھانے کے متعلق بھی رشید صاحب کا نظریہ قابل ملاحظہ ہے ۔ فرماتے ہیں :۔

"زیادہ سونا اور زیادہ کھانا میرے نزدیک نحوست اور بد توفیقی ہے یہ باتیں صرف مریضوں اور لیڈروں کے لئے روا رکھی جا سکتی ہیں ۔ دنیا اور اس کے کاروبار اتنے دل چسپ تھے اور ہر آن انسان کو بہتر و برتر بنانے میں اس درجہ معاون ہوتے تھے کہ میں سونے میں ان کو کھونا گوارا نہیں کر سکتا تھا ۔ سونا محض سونے کی خاطر میرے نزدیک فعل عبث تھا ۔ دنیا دیکھنے اور برتنے کا جو لطف اور ذمہ داری ہے اس کو آدمی سمجھے تو میرا خیال ہے کہ وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی سونے پر آمادہ نہ ہوگا"

ایک مکمل ادیب ہونے کی بنا پر رشید احمد صاحب سیاسیات اور سیاسی لیڈروں سے ہمیشہ مجتنب رہے ہیں چنانچہ ارشاد ہے

"سیاسی سرگرمیوں کی خاطر نہ مجھے جیل خانہ پسند تھا نہ جاہ و منزلت میں اس آدمی سے بہت خوش رہتا تھا

جو مجھ سے کم سے کم ملتا اور زیادہ سے زیادہ مجھ سے کام لیتا۔ مجھے درباداری سے سخت نفرت تھی درباداری کے محتاج وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود اپنی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں اور اس ذہنی عذاب سے بچنے کے لئے وہ دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اپنا نفس لعنت بھیجتا ہے تو وہ کرایہ کے قصیدہ خواں اپنے ارد گرد رکھتے ہیں۔ طوائف سے ہمدردی بھی کی جاسکتی ہے۔ درباروالوں پر صرف لعنت بھیجی جاسکتی ہے"[۱]

میری ملاقات

۱۹۲۱ء میں مولوی ضیاء الرب بی۔ ایس سی امروہی سپرنٹنڈنٹ محکمہ صنعت و حرفت کانپور کے ساتھ علی گڈھ آیا۔ مولوی صاحب نے پہلے پہل قاضی جلال الدین مرادآبادی لکچرار جغرافیہ و تاریخ سے ملایا اور اپنے ہم سبق ماسٹر احسان الحق ایم ایس سی لکچرار کیمسٹری کے یہاں ٹھہرایا۔ قاضی صاحب رشید صاحب کے یہاں ملاقات کرانے لے گئے کہنے لگے مرزا غالب اور مولانا آزاد کے درمیانی اردو نویس سے ملاے دیتا ہوں۔ رشید صاحب نذیر احمد روڈ پر رہتے تھے۔ چھوٹا سا مکان تھا سہ دری میں تخت بچھا ہوا سامنے دو۔ چار

مونڈھے پڑے ہوئے تخت پر خود بیٹھے ہوئے سامنے پان دان کھلا ہوا دو ایک شاگرد بیٹھے ہوئے۔ قاضی صاحب نے رشید صاحب سے کہا حضرت میرے ساتھی "صاحب الفیل" ہیں۔ رشید صاحب نے گھبرا کر نگاہ عینک کے اوپر سے نکال کر مجکو دیکھا وہ مجھے فیل بان سمجھے، میں ہنس دیا اور کہا حضرت بندہ آگرہ کا رہنے والا اور معاش کے وسائل میں سے ایک سلسلہ فروختگی فیل کا اپنے ساتھ لگا رکھا ہے مگر اس کے ساتھ ہی لکھنے پڑھنے کا بھی شوق ہے دو۔ ایک کتابیں تصنیف کردہ ہیں وہ نذر کیں۔ پھر تو ایسے گھُل مل گئے کہ برسوں کے تعلقات معلوم ہونے لگے۔

جوبلی کالج کی جوبلی میں آگرہ سے علی گڈھ حاضر ہوا۔ ڈپٹی مرزا قسیم بیگ خان بہادر کی کوٹھی پر قیام کیا۔ مولانا مولوی ابرار حسین فاروقی ایم اے (علیگ) ان دنوں لکچرار تھے ان کے ساتھ رشید صاحب سے ملنے گئے۔ پھر بھی وہی نقشہ پاندان کھلا ہوا سامنے رکھا ہے، پُر لطف باتیں رہیں۔ سہیل نکلتا تھا وہ ہم کو بھی ملا۔ مولانا ابوبکر شیث جونپوری سے ملاقات کرائی جُبلی کے پندرہ برس بعد پھر علی گڈھ حاضری ہوئی مولانا ابوبکر شیث اور ڈاکٹر منصوری صاحب دنیا سے رخصت ہو چکے تھے قاضی جلال الدین اور مسٹر بشیر احمد ہاشمی ایم اے۔ مولانا ابرار حسین

فاروقی ایم۔ اے مولوی عبدالشکور ایم اے یونیورسٹی سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ مولوی سید الطاف علی صاحب بی۔ اے بریلوی کے پاس ٹھیرے۔ اُنھوں نے "مجلس مصنفین" کے نام سے ایک علمی ادارہ بنا رکھا تھا۔ علامہ کیفی چریاکوٹی۔ پروفیسر آل احمد سرور ایم اے مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر۔ مولانا سید طفیل احمد۔ خان بہادر عبدالمجید قریشی۔ مولوی ظہیر الدین علوی ایم۔ اے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایم اے۔ مولانا عبدالعزیز میمن جوناگڈھی۔ شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب فلسفی۔ پروفیسر عبدالغفور ایم اے۔ ماسٹر سراج الحق بی اے۔ شمس العلماء مولانا محمد امین عباسی چریاکوٹی مولانا اکرام اللہ خاں ندوی۔ ڈاکٹر رفیق احمد خاں۔ پروفیسر سید بشیر علی۔ حکیم عبداللہ خاں نصر۔ ڈاکٹر معین الحق جیسے ارباب فضل و کمال سے ملنا ہوا۔ رشید صاحب سے بھی مجلس کی چوتھی نشست میں ملاقات ہوئی۔ اب کے دیکھا فکر میں زیادہ رہتے ہیں کم سخن ہو گئے تھے مگر طرز زندگی میں کوئی تبدیلی نہ پائی جیسا ۲۵ برس پہلے دیکھا تھا ویسا ہی اب پایا۔

شعر گوئی رشید صاحب کی شاعرانہ زندگی کا کھوج نہ لگ سکا۔ یہ ضرور ہے کہ شعر کہنے سے بڑھ کر اساتذہ

کے چیدہ شعر ایسے یاد ہیں جن کا جواب نہیں۔ اپنی تحریرات میں اکثر جگہ جو شعر لکھ جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے شاعر نے اس موقع کے لئے یہ شعر کہا تھا۔

سخن فہمی سخن فہمی میں رشید صاحب کو ایک درجہ حاصل ہے۔ آپ شاعر کا کلام سُن کر عموماً داد نہیں دیتے بلکہ سُن لیا کرتے ہیں۔ مگر دیکھنے میں اکثر یہ آیا ہے اگر اچھا شعر سنا تو چہرہ پر شگفتگی آگئی ورنہ کچھ نہیں۔

ایک مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور نے عصرانہ پر مولوی سید الطاف علی صاحب اور مجکو بلایا۔ رشید صاحب وہاں موجود تھے۔ ہندوستان کے ایک مشہور شاعر بھی حیدرآباد سے آئے ہوئے تھے انھوں نے اپنا کلام سنایا۔ ہر ایک نے داد دی مگر رشید صاحب کے چہرے کی حالت میں دیکھتا رہا۔ ایسے ہی دوسرے شاعر جو صاحب علم بھی ہیں اور معقول میں بھی ایک درجہ رکھتے ہیں اُن کے کلام کو بھی سنتے دیکھا۔ رشید صاحب خاموش ہی رہے۔ شعر کی شرح البتہ جس طرح کرتے ہیں اس سے اُن کی سخن فہمی کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو شعر کے سمجھنے اور سمجھانے میں ملکۂ خاص ہے مرزا غالب نے اپنے زمانہ میں منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی کی داد دی[1]

---

[1] خط بنام مرزا تفتہ اردوئے معلّٰی

ہے۔ میں رشید صاحب کا قائل ہوں۔

مضمون نگاری اپنی مضمون نگاری کے بارے میں رشید صاحب فرماتے ہیں کہ :۔

"لکھنے میں ظاہری ارادے کو بھی دخل ہوتا ہے اور میں خود بھی ارادہ کرتا تھا۔ لیکن در اصل میرے لکھنے میں میرے ارادے کو اتنا نہیں جتنا ایک خاص لمحہ کو دخل ہوتا تھا۔ یہ میں کبھی نہ دریافت کرسکا کہ وہ لمحہ کب اور کیسے میسر آسکتا تھا۔ میں لکھنے میں ابتدا اور ارتقا اور عروج وغیرہ قسم کی بات ملحوظ نہیں رکھتا تھا۔ مخلصانہ اور بے تکلف گفتگو میں ان امور کی پابندی نہیں کی جاسکتی اور نہ کرنا چاہیئے۔ مجھے مضمون نگاری کی متداول آداب و تسلیمات بھی نہ آتے تھے میں قارئین کو اپنا اچھا اور بے تکلف دوست سمجھ کر گفتگو کرنا شروع کرتا تھا۔ اچھا اور بے تکلف دوست ہی نہیں بلکہ اچھا اور بے تکلف خاندان بھی جس میں جوان بوڑھے۔ بیمار۔ تندرست۔ ملول مسرور سبھی ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس حلقے میں ایک اچھے رفیق کی حیثیت سے پیش کرتا تھا۔

اچھی گفتگو کسی پروگرام کے ماتحت نہیں ہوا کرتی کہ صرف یہ ہوگا اور یوں ہوگا گفتگو کرنا ایک سفر کی مانند ہے جس میں مختلف مناظر مختلف اشخاص اور مختلف حالات و حوادث سے سابقہ ہوتا ہے۔ ایک اچھا آدمی ہم سفروں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اور اُن کے رنج و راحت کو اپنے رنج و راحت پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ شرافت ہی کی نہیں اچھے لکھنے والے کی بھی پہچان ہے۔ لکھنے میں اور گفتگو کرنے میں بھی رونا۔ گڑگڑانا۔ رعب بٹھانا اور قابلیت جتانا نا اہلوں کا کام ہے۔ میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے تھے۔ مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں۔ ان مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور بہکی بہکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے فن کی شریعت کے عین مطابق ہیں۔ میں خود بھی بھٹکتا تھا دوسروں کو بھی بھٹکنے کی فرصت دیتا تھا۔ عقل کی باتیں دیر تک نہ سُنی جا سکتی ہیں نہ سنائی جا سکتی ہیں"[1]

---

[1] "اپنی یاد میں" علی گڈھ میگزین صفحہ ۱۳۱

علمی شغف

اردو زبان سے دلی لگاؤ اور تعلق آپ کو اوائل عمری سے رہا ہے۔ علی گڈھ میگزین کی ادارات عرصہ تک کی۔ آپ کی طرز تحریر جس کا ذکر آگے آئے گا اور طرز تعلیم دونوں محتاج تعارف ہیں۔ اس کا اعتراف ہر ماہر تعلیم اور ہر طالب علم کرتا ہے جو آپ کا شاگرد رہ چکا ہے۔ ہندوستان کی علمی مجالس میں شریک ہوئے اور ہر جگہ آپ کی زبان اور قلم نے میدان مارا ہے۔ اسلامیہ کالج لاہور۔ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ مجلس مصنفین علی گڈھ۔ دار المصنفین اعظم گڈھ وغیرہ غرض کہ ہر جگہ آپ کافی دھوم دھام مچا چکے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ کی تحریک پر سنہ ۱۳۴۲ھ میں "موڈرن یورپ" مصنفہ ڈبلو ایس فلپ ایم۔ اے کا اردو ترجمہ "تاریخ یورپ جدید" کے نام سے کیا اور سترہ سو روپئے انعام میں حاصل کیے ترجمہ با محاورہ اور دلچسپ اور زبان صاف و شستہ ہے جس طرح واقعاتی مضمون یا مضحکات پر قلم اٹھاتے ہیں اس طرح شستہ زبان میں سادہ ترجمہ بلا توقف کرتے چلے جاتے ہیں اس طرح آپ کا مضمون اردو کی ترقی اور اس کا مستقبل جو آپ نے سنہ ۳۶ء کی انجمن ترقی اردوئے معلی کانفرنس میں پیش کیا آپکی معرکتہ الآرا تحریرات میں سے ہے۔ علاوہ یونیورسٹی میگزین

کے آپ نے رسالہ "سہیل" جاری کیا جو مضامین کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ تھا۔ طباعت کے پہلو سے بھی بہت نفیس اور دیدہ زیب بنانے میں کوئی سعی اٹھا نہ رکھی۔

طرز نگارش آپ نثر اردو میں اپنی طرز کے انوکھے نثر نگار ہیں۔ گو اور بھی لوگ اس طرز پر لکھتے ہیں مگر انداز نرالا ہے۔ اور طنزیات میں اچھوتا اسلوب ہے۔ سیّد اعجاز حسین اعجاز ایم اے نے "تاریخ ادب اردو" میں رشید صاحب کی طرز نگارش پر جو لکھا ہے وہ ایک حد تک درست ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

"طنز ایک مشکل صنف ادب ہے ذراسی لغزش بھی مضمون کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہوگی۔

مولانا رشید احمد طنز کے واحد لکھنے والے ہیں اور نہایت کامیابی کے ساتھ اپنا رنگ سب سے جداگانہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں ایک طرح کی شستہ ظرافت ہے۔ رمز و کنایہ میں تنقید کے دشوار گزار مراحل کو طے کر لینا رشید احمد کا کام ہے۔ ان کے ذاتی جذبات اور احساسات جو واقعے کے متعلق ہوتے ہیں ایک طنزیاتی انداز میں اس طرح ظاہر ہو جاتے

ہیں کہ پڑھنے والا انھیں مذاق سمجھ کر ٹال نہیں سکتا وہ کانٹوں کی طرح دامن میں اُلجھ کر اپنا اثر پیدا کر ہی دیتے ہیں۔

رشید احمد صاحب کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے وہ واقعات کی طرف لطیف اشارے کرتے ہیں صرف وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو تاریخ وسیاست سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ ایک بات کہہ کر گزر جاتے ہیں اور ذہن اس کے اجزاء کو جمع کر کے کوئی نتیجہ نکالنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ان کے خیالات کی دور رس گہرائی اور نزاکت عام مذاق سے بالکل علحدٰہ ہوتی ہے۔ رشید صاحب کے یہاں ذہانت کا ثبوت ہر جگہ نمایاں ہے۔ اُن کی مثالیں اُن کے مضامین کی جان ہیں۔ وہ "ارہر کا کھیت" ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ اس کو اسمبلی اور پارلیمنٹ کے دوش بدوش دکھا سکتے ہیں۔ طائر خیال کی یہ پرواز مثال کے موقع پر وہ چیزیں کر جاتی ہے جس سے ذہن کہیں سے کہیں پہونچ جاتا ہے ان کی زبان مشکل عربی و فارسی کے الفاظ سے نقش و نگار حاصل کرتی

ہے۔ ان کی عبارت اپنے خیال کی بلندی اور
الفاظ کی ترتیب کی وجہ سے عام فہم نہیں ہے
لیکن ایک طرح کی روانی ہر جگہ پائی جاتی ہے
شگفتگی مضمون کے ہر حصہ میں نظر آتی ہے۔ فلسفیانہ
مباحث بھی اسی شگفتہ انداز میں بیان ہو جاتے
ہیں"۔ [۱]

یہ بھی رشید صاحب کی نثر نگاری کی خصوصیت ہے
جس نے ہر طبقے میں آپ کا ایک درجہ پیدا کر دیا ہے۔
علامہ سر اقبال مرحوم۔ ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر
ڈاکٹر عبدالحق دہلوی سے حضرات نے آپ کے طرز تحریر
کی داد دی ہے۔ غرض کہ طنز یہ طرز کے موجد ہونے کا
سہرا آپ کے سر ہے۔

تصانیف مضحکات، خنداں، مضامین رشید، گنجہائے
گراں مایہ بقیہ کتب کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے

سہیل کی سرگزشت رسالہ سہیل کے جو مضامین ہیں
وہ عہد جوانی کے ہیں اُن میں
شوخی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ پڑھتے جائیے۔

---

[۱] تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۳۱

مسکراتے جائیے۔ عالم شباب کی تحریر ہوتے ہوئے ثقاہت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہ کمال ہے کہ تحریر میں شوخی بھی ہے اور وقار بھی۔

ان مضامین کو مولوی سید الطاف علی صاحب بی اے بریلوی نے یکجا کرکے "سہیل کی سرگزشت" کے نام سے شائع کیا ہے اور اس طرح ادبیات اردو میں رشید صاحب کی ایک گراں مایہ تصنیف کا اضافہ کرکے شکریہ کا موقع دیا ہے۔ لہذا ارباب علم اس مجموعہ کو پڑھیں اور لطف اندوز ہوں۔

"بیت المصنّف" علیگڑھ
۱۴ اگست ۱۹۴۶ء

انتظام اللہ شہابی

سُہیل کی سرگزشت

۱

سنتِ دیرینہ بالآخر مجھے بھی وہی پیش آیا جو "واضع کار" کو کسی وقت پیش آیا تھا اور جس کا تدارک آج بیسویں صدی میں بھی نہ ہو سکا یعنی دِقّتِ کار! اگر ہر کار سے وقت یا زحمت کا عنصر حذف کر دیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ کچھ اور نہیں تو اڈیٹر اور خریداروں میں کم سے کم وی پی اور منی آرڈر قسم کی کوئی بد مزگی پیدا نہ ہو۔ اخبارات کی خبریں اور رائیں اکثر مشتبہ ہوا کرتی ہیں لیکن جہاں تک اردو اخبار نویسوں کا تعلق ہے میرا خیال ہے، ان کا یہ اندیشہ ہمیشہ صحیح ہوا کرتا ہے کہ اخبار کو خریداروں کی کمی ضرور محسوس ہوگی اور کچھ اور نہیں تو اتنی اپیل تو کرنی ہی پڑیگی کہ ہر خریدار کم سے کم ایک خریدار اور بنائے۔ نظر برآں میری تجویز یہ ہے کہ ہر اردو رسالہ یا اخبار کا نام

اُپیل" اور مدیر یا مرتب کا نام "اپیلانٹ" ہو۔ اس سے کم سے کم نام کے انتخاب کرنے میں تو دقت کا سامنا نہ کرنا پڑیگا۔

رسالہ اور انجمن مجھے رسالہ ہذا کے نام تجویز کرنے میں کافی غور کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں بعض احباب اور بزرگوں کو بھی زحمت دینی پڑی لیکن کہیں سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ آیا بعضوں نے ایسے نام تجویز کیئے جن کے ادا کرنے کے لیئے لازم تھا شین قاف پر ضرورت سے زیادہ عبور ہوتا، کچھ ایسے بھی تھے جن سے اندر سبھا اور فسانۂ عجائب کی یاد تازہ ہوتی تھی، ایک صاحب نے جگت بھاشا تجویز کیا لیکن پھر انجمن اُردوئے معلی کی بجائے اردو سنگھٹن اختیار کرنا پڑتا۔ بعض حضرات نے ایسے نام بھی پیش کیئے جن کے موزوں اور برجستہ ہونے میں کلام نہیں ہوسکتا تھا' لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اس سے رسالہ اور مرتب دونوں کا انجام غیر معمولی سرعت کے ساتھ مستقبل سے حال میں تبدیل ہو جاتا۔

انجمن اردوے معلی کی بنیاد عرصہ ہوا مولانا حسرت موہانی مدظلہٗ نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں علی گڈھ کالج میں رکھی تھی اور اسی نام کا مولانا کی ادارت میں ایک علمی رسالہ بھی شایع

ہوتا تھا، پچھلے سال انجمن کا احیا، یونیورسٹی میں ہوا تو ساتھ ہی ساتھ ایک رسالہ نکالنے کی بھی تجویز پیش ہوئی، لیکن بوجوہ اس میں کامیابی نہ ہوسکی۔ اس سال آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور صدر انجمن نے اس کی اجازت مرحمت فرمائی تو خیال ہوا کہ رسالہ کا نام اُردوے معلی رکھا جائے۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ اس نام کا ایک رسالہ دہلی سے نکل رہا ہے اور دوسرا خود مولانا حسرت موہانی کان پور سے شائع فرما رہے ہیں۔ خیال آیا کہ جب انجمن ایک طور پر ہمارے حصہ میں آئی تو رسالہ کے نام کے لئے نیت ڈانوا ڈول نہ کرنی چاہیئے لیکن بہ نظرِ احتیاط ہم انجمن کے نام کے متعلق بھی مولانا ممدوح سے عذر خواہ ہیں، ہم تو صرف اس کے نام لیوا ہیں اور غالب کے ہمنوا

ع کم نہیں ہمنامیِ چشمِ خوباں!

اور یہ بھی محض اس لئے کہ تفاؤل نیک ہو، اور دوسرے یہ کہ "نقش ثانی" "نقش اوّل" سے بہتر نہ ہوسکے تو کم سے کم نام کی تو "سند" رہے۔

ایک زمانہ میں راقم الحروف اور (یادش بخیر) ذاکر حسین خاں صاحب بی اے (علیگ) کالج میں ساتھ رہتے تھے اور

حسن اتفاق سے جس روز ایسا کھانا ملجاتا جسے کالج ڈائننگ ہال کی ہوا تک نہ لگی ہوتی، ہم دن کا دن اور رات کا بیشتر حصہ ایک بہترین اردو رسالہ نکالنے کی اسکیم مرتب کرنے میں صرف کر دیتے تھے لیکن یہ تمام منصوبے محض اس چٹان سے ٹکرا کر فنا ہو جاتے کہ رسالہ کا نام کیا ہوگا! ذاکر صاحب نے تو آخر میں طے کر لیا تھا کہ ہم نام کی جگہ خالی چھوڑ دیں گے لیکن رسالہ ضرور نکالیں گے۔ افسوس کہ یہ جدت بھی بر روے کار نہ آسکی ۱۹۲۲ء ۱۹۲۳ء میں ذاکر صاحب نے ہندوستان کی سرزمین کو خیر باد کہا۔ اس وقت تک صرف دو نام تجویز کئے جا سکے تھے، ایک شمع دوسرا سہیل۔ شمع تو ایک صاحب نے اُڑا لیا، اب صرف سہیل باقی رہ گیا تھا، پچھلے دنوں سید سجاد حیدر صاحب (یلدرم) سے اس کا تذکرہ آیا تو فرمانے لگے، یہ نام عرصہ سے میرے ذہن میں ہے۔ میں نے خیال کیا کہیں اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تو پھر ذاکر صاحب بھی نہیں ہیں۔ اس ہفتواں کو نئے سر سے کون طے کرے گا اور پوری تنخواہ کا بھی مستحق ہوگا۔ جلد سے جلد اسی نام کا اعلان کرنا پڑا۔ گو یہ یقین تھا کہ سید صاحب سے

وہ جنوں انگیزیاں رخصت ہوئیں ؛ عقل سے وہ شرمساری اب کہاں

کہہ کر اس قسم کی جرأت رندانہ کو دخل نہ دیتے۔ لعضوں کا خیال ہے یہ شعر سید صاحب نے بمبئی کے مشہور یورپین ہسپتال میں تصنیف کیا تھا جہاں وہ حادثہ موٹر کے بعد داخل کئے گئے تھے' دوسروں کا بیان ہے کہ یہ اس سے قبل کا کہا ہوا ہے ورنہ ہسپتال میں داخلہ ناممکن تھا۔

میں چاہتا تھا کہ نام مُفرد ہو' سہل و رواں ہو' اور ہیئت تحریری وصوتی دونوں ایک طور پر "جنت نظر" اور "فردوس گوش" ہوں یہ ایسی پابندیاں تھیں جن سے میں یا مرے احباب اور بزرگ کوئی عہدہ برا نہ ہو سکا پھر یہ بھی ہے اگر موجودہ عہد میں نفس مضمون کو عنوان مضمون سے نسبت ہونی ضروری نہیں تو پھر رسالہ کے نام سے رسالہ کے مضامین کا ربط ہونا بھی لازم نہیں ہونا چاہیئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان کا کوئی رسالہ یا اخبار ایسا نہیں ہے جس کے مضامین کو رسالہ کے نام سے ربط نہیں ہے ضرور ہیں مثلاً "..... اردو" ! لیکن یہ سعادت عام نہیں ہے۔

"یہ چند کلمات" بطور "حفظ ماتقدم" "استعمال" کئے گئے ہیں

اب رہا رسالہ کی شان نزول۔ اگر کوشش کی جائے تو یہ داستان نہایت طویل اور اتنی ہی بے معنی ہو سکتی ہے۔ میں اس کی بھی کوشش کرتا لیکن جانتا ہوں اس صورتِ حال سے مجھ سے زیادہ ناظرین

خود واقف ہیں۔ کسی اُردو رسالہ کے سرورق کا مطالعہ کیا جائے دریا ہی نہیں ایک اوقیانوس کوزہ میں بند نظر آئے گا۔ علمی، اخلاقی، روحانی، مذہبی، تمدنی، معاشرتی، سیاسی، اصلاحی، اقتصادی، تفریحی غرض کہ سب کچھ جو اس وزن اور قافیہ پر صحیح اُتر سکے، موجود ہوتا ہے۔ ان بلند آہنگ دعاوی کے بعد ایک ضعیف الاعتقاد یا ضعیف القلب کو دم مارنے کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ آخر اس کے بعد کوئی لکھ ہی کیا سکتا ہے ہمارے بزرگ محترم وحید الدین سلیم صاحب وضع اصطلاحات کا دوسرا ایڈیشن شائع فرمائیں تو ممکن ہے اس قسم کی بعض جدید ترکیبیں وضع کی جاسکیں۔

اغراض و مقاصد

اس کے بعد اغراض و مقاصد کا نمبر آتا ہے۔ سہیل کے پیشرو اور معاصرین نے ہم پر یہ دنیا بھی تنگ کر دی ہے اور اب یہ کہنے میں بھی جدت نہیں رہی ہے کہ ایسے اُردو رسائل، اخبارات کم ملیں گے جن کی دعاوی ان کے کارناموں سے ہم آہنگ ہوں ہماری تو صرف یہ دعا ہے کہ سہیل ان لوگوں میں مقبول ہو جن کی خدمت کا اس نے عہد کیا ہے اور ان مقاصد میں کامیاب ہو جو اس کے پیش نظر ہیں۔ وعدہ کی ذمہ داری ہمارے

بس کی نہیں ہے۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ ہم نے جس کام کو شروع کیا ہے اس کے نیک اور مفید ہونے کے قائل ہوں اور اس کو استقلال اور ایمانداری کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کریں۔ ہماری نیک نیتی خود ہمارے لیئے معاوضہ ہوگی اس لئے انجام کے متعلق ہم کو کچھ زیادہ فکر نہیں ہے۔

بعض حضرات آزردہ ہوں گے کہ میں نے اس سلسلہ میں علی گڑھ کے گزشتہ کارناموں کا اعادہ کیوں نہیں کیا اور ان کا واسطہ دلاکر سہیل کا تعارف اس کے آیندہ محسنوں سے کیوں نہیں کرایا۔ اس میں شک نہیں اُردو کا نشأۃ الثانیہ علی گڈھ میں طلوع ہوا اور اس وقت اردو کو جو فروغ حاصل ہے وہ ایک بڑی حد تک فرزندانِ علی گڑھ ہی کی قربانی اور قابلیت کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم اپنی غفلت اور ناقابلیت کو چھپانے کے لئے اُن اسلاف کا وسیلہ ڈھونڈیں جو زندہ ہوتے تو ہمارے اس فعل سے پشیمان ہوتے۔ موجودہ دور میں فرزندانِ کالج جہاں کہیں جو کچھ کر رہے ہیں وہ ہر طور سے قابل ستایش ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ علی گڑھ کی موجودہ نوخیز نسل کیا کر رہی ہے؛ اس میں کچھ کر دکھانے کی ہمت اور قوت بھی ہے۔ حسرت۔ ظفر علی خان۔

محمد علی، محفوظ علی، عنایت اللہ، سجاد حیدر، عبدالحق اس زمانہ کی یادگار ہیں جو کالج کا بہترین دور تھا، اور اس وقت ہماری تمام تر کوشش اس سے بہتر نہیں تو اسی پایہ کے لوگوں کی پیدا کرنے میں صرف ہو رہی ہے۔ ہم اپنی زبانوں کی جنبش اور قلموں کی روانی سے سر سید، محسن الملک، نذیر احمد، حالی، شبلی، آزاد، چراغ علی یا عزیز مرزا کو زندہ نہیں کر سکتے لیکن اپنے ایمان اور استقلال سے اپنے اسلاف کے کارناموں کو عالم پر روشن کر سکتے ہیں۔

ہاں میں اس امر کا اعتراف کروں گا کہ سہیل کو وہ تمام سہولتیں حاصل ہیں جو علی گڑھ سے وابستہ رہ کر کسی اس قسم کی تحریک کو حاصل ہو سکتی ہیں۔ علی گڑھ اب بھی ملک و ملت کے لئے دلیل راہ بن سکتا ہے، اس سرزمین کو وہ برکتیں حاصل رہی ہیں جو صدیوں اور قرنوں میں حاصل ہوتی ہیں، ہندی مسلمانوں کے بعض بہترین دل و دماغ یہاں پیدا ہوئے، ابھی اس کی ساکھ دلوں میں باقی ہے اس لئے ہر وہ چیز جو اس سرزمین سے وابستہ ہوگی اور ان طریقوں سے شروع کی جائے گی جو خدا اور خدا کے برگزیدہ بندوں کے نزدیک مستحسن ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ پایان کار، اس کو کامیابی

نصیب نہ ہو۔ لیکن ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کے لیئے علی گڑھ کی شاندار روایات سے قبل از وقت فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے' اگر ہمارے ناظرین اس بنا پر ہم کو قابل مرحمت تصور فرمائیں کہ ہم ایک بڑے عہد کی یادگار اور بزرگ اسلاف کے نام لیوا ہیں تو یہ اُن کا عین کرم ہے ورنہ جب تک ہم اپنے آپ کو اس کا اہل نہ ثابت کریں ہم اپنے ناظرین سے اس قسم کی توقعات رکھنا اپنے احساس خودداری کے منافی سمجھتے ہیں اور اس بنا پر ہم کو امید ہے ہمارے کرم فرما ہم کو قابل ستائش نہیں تو قابلِ تعزیر بھی نہ تصور فرمائیں گے۔

اُردو اور ہمارا عقیدہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم اپنے مستقبل کو ہمیشہ جراءت اور امید کے ساتھ دیکھنے کے خوگر ہیں۔ اس لیئے مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ باوجود اس کے کہ اس وقت اردو کی فضا تاریک ہو رہی ہے اور دوسری زبانوں کا مطلع نسبتاً زیادہ روشن نظر آرہا ہے' اردو کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اُردو میں ترقی کی کافی استعداد ہے اور ہندوستان کی دو زبردست متمدن قوموں کا یہ ایک

ادبی مفاہمہ ہے، اس لئے اس کا مستقبل کبھی یاس انگیز نہیں ہوسکتا۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہم اپنی استعداد اور اپنے جہتم بالشان نصب العین کے منکر نہ ہوں۔ ہم کو اُردو کی حمایت میں ہندی یا کسی دوسری زبان کا مخالف نہ بننا چاہیئے۔ یہ کس قدر صریح حقیقت ہے کہ اگر ہم ایک چیز کے شیدائی ہیں تو دوسروں کو دوسری چیز پر مفتوں ہونے کا حق حاصل ہے۔ اگر ہندو اور مسلمان یا دوسری قومیں ہندوستان کے صُلح جو اور عافیت پسند شہری بن سکتے ہیں، اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، تو پھر کیا وجہ اُردو، ہندی یا دوسری زبانیں اپنی اپنی جگہ پر ترقی کر کے ایک ہی بلند اور مساوی سطح پر نہ آسکیں اگر ایسا نہ ہوسکے تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے نصب العین ہمارے زاویہ نگاہ اور طریق کار میں نقص ہے۔ اختلافات کہاں نہیں ہوتے، اختلافات نہ ہوں تو زندگی کی حیثیت تعطلِ محض کی رہ جاتی ہے اور یہ موت یا نیستی کا دوسرا نام ہے۔ ہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے اختلافات ایمان داری اور خلوص پر مبنی ہوں، دنیا اس حقیقت کو محسوس کر چکی ہے کہ ہر عمل خود اپنی مکافات ہے اس لئے

دوسروں کو زک پہونچانے کی بجائے ہم کو اپنے خلوص اور لامتناہی استعداد پر بھروسا رکھنا چاہیئے دنیا کی کشمکش سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر فرد میں بے پناہ قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، اگر وہ ان سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتا یا اُن کو غلط مصرف میں لانا چاہتا ہے تو یہ اس کی پست ہمتی و کوتاہ نظری ہے. ہم اُردو کو ہر وقت اور ہر مخالفت کے مقابلہ میں کامیاب رکھ سکتے ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ہم جیسا نصب العین مقرر کریں اس کے مطابق جفاکشی اور جفا طلبی کے بھی خوگر ہوں۔ صرف اخباروں میں مضامین لکھنے، تجاویز پاس کرنے، پلیٹ فارم پر دادِ فصاحت دینے یا رسالوں اور صحیفوں کے شایع کرنے سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر کام کرنا ہے تو پھر چاہیئے کہ ہم جو کہیں یا کریں اُس پر عقیدہ رکھتے ہوں اور عقیدہ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہم کو کسی وقت اور کسی طور پر پست خیال یا پست ہمت نہ بنا سکے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تمام دنیا کو ہمیشہ کے لیئے دھوکا دے سکتے ہیں۔ اور اکثر ہم اپنی ذاتی منفعت کے لیئے آسمان و زمین

ایک کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے فریب کی کامیابی ہمارے مقصد عظیمہ کی کامیابی ہے۔ لیکن یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق ہماری سب سے بڑی کتاب میں "خسران مبین" کا لفظ فرمایا گیا ہے!

ہمارا مسلک

اس کے بعد ناظرین منتظر ہوں گے کہ ہم کچھ اس رسالہ کی نوعیت کا بھی تذکرہ کرینگے بالفاظ دیگر اس میں کس قسم کے مضامین ہوں گے' ان کا علمی یا تحقیقی پایہ کیا ہوگا' کن لوگوں کے مذاق کی چیزیں ہونگی کون لوگ مضامین نگار ہوں گے' وغیرہ وغیرہ۔ سب سے پہلے ہم کو یہ عرض کر دینا ہے کہ اس رسالہ کا مقصد مفید اور دلچسپ ہونا ہے' نظر بر آں جو چیزیں مفید اور دلچسپ ہونگی اُن کو اختیار کرنے میں ہم کو کبھی تامل نہ ہوگا۔ لیکن اگر ہم صرف اتنا ہی عرض کر دینے پر اکتفا کریں تو ممکن ہے اس سے غلط فہمی اور آئندہ چل کر بعض سنگین پیچیدگیوں کا سامنا ہو اس لئے اس بحث کو کسی قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کرنا غالباً بے موقع نہ ہوگا۔ ہمارا مقصد سہیل کے اوراق میں ایسی چیزیں پیش کرنے کا ہے جو نوجوان اور کہن سال دونوں کی سنجیدہ دلچسپی کا باعث ہوں۔ آج کل بہت

سے رسائل ایسے شایع ہوتے ہیں جن کو مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید لکھنے اور پڑھنے والے دونوں کو عہد برطانیہ میں "جوانی کی راتیں"، "مرادوں کے دن" کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو چالیس سال سے کم عمر والوں کے لیئے ایک حد تک ارض ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ باعتبار مصلحت ہم ایسی چیز پیش کرنے کے مدعی اور آرزومند ہیں۔ جو چہل سالہ کیا ۵۵ سالہ "پنشن یافتوں" کی سنجیدگی سے بھی بڑھ جائے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی دل سے نہیں نکلتا کہ آخر ان بزرگوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تو ہوں گے جن کو شیخ سعدی علیہ الرحمتہ نے

ع۔ "مزاجِ تو از حالِ طفلی نگشت" سے مخاطب کیا ہے۔

اندیشہ ہے کہیں ان خیالات کے اظہار سے بعض بزرگوں کو آزردگی نہ ہو۔ حاشا، راقم الحروف کا یہ منشا نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اپنی اپنی جگہ پر بعض رسائل بہترین مقاصد کی تکمیل کا باعث ہو رہے ہیں، ان کی کامیابی ایک بڑے مقصد کی کامیابی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ان میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے، پھر ہم اس کے بھی مدعی نہیں ہیں کہ سہیل بہمہ جہت مکمل اور

اپنے مقاصد میں یکسر کامیاب ہوگا۔ دنیا کا کوئی مقصد کبھی پورے طور پر سرانجام نہیں پا سکا ہے، مقاصد کی کامیابی کا معیار صرف یہ ہے کہ اس کے حصول میں اس کے علمبرداروں نے کہاں تک خلوص اور جانفشانی سے کام لیا۔

اُدب لطیف" یا "جنس لطیف" یہاں تک تو یہ عرض کیا گیا ہے کہ سہیل کے اوراق کس قسم کے مضامین کے حامل ہوں گے۔ لیکن ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ شروع ہی سے اس امر کا بھی اظہار کردیا جائے کہ سہیل کس قسم کے مضامین سے حتی الوسیع بچتا رہے گا۔ سہیل میں اس قسم کے کوئی مضامین راہ نہ پاسکیں گے جن کو آج کل عرف عام میں "ادب لطیف" بتایا گیا ہے "ادب لطیف" اور "ٹگوریت" نے سب سے بڑا ظلم یہ کیا ہے کہ اس نے الفاظ کی ایک چیستان مقرر کردی ہے جن کے سمجھنے یا ان سے مستفید ہونے کے لئے ضرورت سے زیادہ عقل و دماغ یا پھر "رقیق جذبات" کی ضرورت ہے، یہ صنف انشا ہمارے ان نوجوانوں میں بہت مقبول ہے جو انشاء وادب کو بھی "صبح بنارس" اور "شام اودھ" تصور کرتے ہیں۔ شباب کی ہنگامہ زائی اور اس کی لطیف معصیتیں مسلّم لیکن بد مذاقی اور کورانہ

تقلید بہرحال قابلِ ملامت ہے۔ سہیل کے اوراق کبھی
کسی ایسے مضمون کے لئے سادہ نہیں رکھے جائیں گے جس
کا جائزہ لینے پر معلوم ہو اکہ الفاظ سے زیادہ رقبہ
بے معنی نقطوں نے گھیر رکھا ہے ہماری نوخیز نسل میں اس
"بد وضعی" کا سبب محض سستے اُردو ناول اور وہ عافیت سوز
فرسودہ اور مبتذل نظمیں بالخصوص وہ غزلیات ہیں جن کا
"آزاد ترجمہ" کردیا جائے تو بعض قسم کے "شاستر" اور ان کے
اشتہار دینے والے بھی چیخ اٹھیں۔ انشائے لطیف کا آج
کل جو مفہوم عام ہے اس کے خلاف جہاد کرنا صحت مذاق
کی دلیل ہے۔ ادب لطیف کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس میں
صرف کلمات استعجاب اور تاسف کے نشانات (!) کی
کثرت ہو یا سطر کی سطر صرف نقطوں سے پُر ہو یا کوئی
"داستانِ معاشقہ" اس طور پر پیش کی گئی ہو گویا کسی "مرض
لطیف" کا پُرچۂ ترکیب استعمال ہے" اسے بد مذاقی سمجھیے
یا کمزوری آج کسی کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ "ادب لطیف"
اور "جنس لطیف" لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ یہ انشایہ دازی
کے مذہب میں کبائر اور معاصی کا مرادف ہے۔ اس "تلخ
نوائی" کے ہم معذرت خواہ ہیں۔ کیا کیا جائے اُردو کے

کے خلاف نادانوں کی یہ ایک ایسی دوستی ہے جس کا تدارک ہم سب پر فرض ہے۔ یہ مرض نوجوانوں میں عام ہے اور اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ عام طور پر غور و فکر کے عادی نہیں ہوتے اور بدقسمتی سے جو چیز اُن کو آسانی سے ملجاتی ہے وہ اسی قسم کے مضامین پر مشتمل ہوتی ہے، جن کی تیاری میں مصنف یا مضمون نگار کو مُطلق دماغ پاشی یا دقت نظر کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی، نیتجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد غور و فکر کی استعداد بالکل مفقود یا مُردہ ہوجاتی ہے اور اُردو کا سرمایہ محدود اور مبتذل ہوجاتا ہے بایں ہمہ ناانصافی ہوگی اگر ہم انشاء لطیف کو صرف اسی عام و عامیانہ مفہوم تک محدود رکھیں۔

انشاء لطیف کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ جذبات لطیف یا رنگین کو تحریر کا جامہ پہنا دیا جائے۔ خیالات یا حسیات کی دنیا میں جو شے ہم کو نہایت لطیف و کیف انگیز معلوم ہوتی ہے اگر ہم اس کے اظہار میں انتہائی حزم و احتیاط، ذوق صحیح اور کمال انشاپردازی سے کام نہ لیں تو پھر ممکن ہے اپنی ہیئت تحریری میں وہی چیز ہماری بد مذاقی، جہالت اور بدسلیقگی کا مرادف قرار پائے۔ انشائے

لطیف کے یہ معنی ہیں کہ آپ کے خیالات اور وسیلہ اظہارِ خیالات یعنی تحریر دونوں میں ایک مناسبت ہو' اِن میں جس قدر نسبت صحیح ہوگی اتنا ہی آپ کا کمال انشاپردازی نمایاں اور روشن ہوگا۔ اس حقیقت کو اچھے طور پر ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ جہاں تک خیالات یا حسیات کا تعلق ہے ہمارا سرمایہ محدود ہوچکا ہے ہاں جو چیز لا متناہی ہے وہ طرزِ بیان ہے بالفاظ دیگر' الفاظ اور جملوں کی مقامی حیثیت ان کی اُلٹ پھیر اور پھر خیالات کے اسلوب اور ترتیب میں اتنی وسعت' ندرت اور لذت پیدا کی جاسکتی ہے کہ اس کا شمار بہترین ریاضی داں بھی نہیں کرسکتا۔ انشاپردازی ایک طرح کا ڈراما ہے۔ ہر لفظ اپنی متقل حرکت' موسیقی اور دلکشی کے ساتھ اپنی مخصوص فضا میں وہی کام کرتا ہے جو ایک ایکٹر اسٹیج پر کرتا ہے۔ جس طور پر ایکٹر کی کامیابی کا مدار صرف اپنے پارٹ کے ازبر کرنے یا مقررہ طور پر اُسے کر دکھانے پر نہیں ہے بلکہ ہر ایکٹ کو وہ اپنی ایک شخصی اور انفرادی حیثیت سے کرتا ہے جس میں اسکی مخصوص استعدادات ذہنی اضطراری طور پر جھلک جاتی رہیں' ٹھیک اسی طور پر ایک کامل الفن انشاپرداز جن الفاظ

اور جملوں کو برسرِ کار لاتا ہے وہ گو بجائے خود نئے نہیں ہوتے لیکن ان کی ترتیب اور تہذیب اس انداز سے ہوتی ہے کہ معمولی سے معمولی دل و دماغ کا انسان بھی سمجھ جاتا ہے کہ وہ ایک بالکل متمائز اور بالکل مختلف صورت حال سے مقابل ہے۔ چارلی چیپ لین کی ہیئت کذائی کون ہے کہ نہیں اختیار کر سکتا لیکن اسٹیج پر کون کس عالم میں ہوتا ہے ایک ایسی حیثیت ہے جس کا ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہم میں کافی لوگ ایسے مل سکتے ہیں جن کا ذخیرۂ الفاظ ابوالکلام یا غالب سے کہیں زیادہ ہوگا لیکن جتنے الفاظ ان لوگوں نے جس طور پر رکھ دیئے ہیں کیا وہ ترتیب ہر شخص کے بس کی ہے۔ بقول حافظ۔ ع:-

ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداری است

آج کل کی نئی روشنی والے، جن میں اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کو ذوقِ سلیم و استعداد فکر سے زیادہ اپنی شخصیت اور اپنے مستعار خیالات کا اظہار مقصود ہوتا ہے، اُردو شعر و شاعری سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں اُردو شعر و شاعری میں نقائص ہیں اور ان کا ازالہ ہر بہی خواہ اُردو کا فرض ہونا چاہیئے۔ لیکن

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اردو شعر و شاعری سرے سے بے کار ہے۔ ہمارے بعض کرم فرماؤں نے نہایت خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ ہم کو مشورہ دیا ہے کہ سہیل کے اوراق غزلیات اور اس قسم کی دیگر صنف کلام سے محفوظ رکھے جائیں۔ ہم ان کے اس مفید مشورہ کی پذیرائی کے لئے آمادہ ہیں اور ایک حد تک اس مسلک کے قائل بھی ہیں لیکن ہم کو یہ کہنے میں مطلق باک نہیں ہے کہ جس چیز (مثلاً غزل) کو ہمارے کرم فرما شبہہ اور نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ فی نفسہٖ اس سلوک کی سزاوار نہیں ہے غزل ہی نہیں ہر وہ کلام جو شاعری کی اس تعریف میں نہیں آتا کہ یہ (شاعری) بہترین خیالات کے بہترین اسلوب بیان کا دوسرا نام ہے' قابل اجتناب ہے۔ شعر و شاعری کلیتہً ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ اس کی پیمائش جریب اور فیتے سے نہیں کرنی چاہیئے۔ جو لوگ اس سے محروم ہیں یا یوں کہہ لیجیئے مصئون و مامون ہیں ان کی کبھی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ انسانوں کی دنیا صرف وہی دنیا نہیں ہے جسے وہ یا اُن کے ہم خیال دیکھتے ہیں یا جسے ڈارون یا آئن اسٹائن دیکھ چکے ہیں۔ ایک دنیا وہ بھی ہے

جس کا مشاہدہ کالیداس، غالب، شکسپیر، گوئٹے، حافظ، خیام اور امراء القیس بھی کر چکے ہیں۔ نظر برآں ہم کو اس حقیقت کے اظہار میں مطلق باک نہیں ہے کہ سہیل کے اوراق ہر قسم کی نظموں کے لئے وقف رہیں گے۔ رہا یہ کہ یہ نظمیں کس پایہ کی ہونگی اس کا اشارہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ رسالہ ہذا میں کوئی ایسی نظم راہ نہ پاسکیگی جس کی پاکیزگی کے متعلق دو رائیں ہوں۔ بہت ممکن ہے اس کے کسی نمبر میں کوئی نظم ہمرے سے نہ ہو لیکن یہ ناممکن ہے کہ اس میں ہر شاعر کی تالیف قلوب کے لئے گنجائش نکالی جاسکے۔

ہمارے طلبا

اس سلسلہ میں بے موقع نہ ہوگا اگر ہم اپنے طلبا کو بھی تھوڑی دیر کے لئے مخاطب کریں کیونکہ سہیل کی موجودہ اور آیندہ قسمت انھیں کے صحت ذوق اور استعداد فکر سے والبتہ ہوگی ہم کو اُمید ہے ہمارے عزیز طلبا ہم سے آزردہ نہ ہونگے اگر ہم ایسے وقت میں جب وہ اپنی آیندہ زندگی کے لئے تیار ہو رہے ہیں، کچھ ایسی باتیں بھی اُن کے گوش گزار کردیں جو بہت ممکن ہے اس وقت اُن کو خوشگوار نہ معلوم ہوں لیکن ہم کو یقین ہے سال وسنین کے بارسے

جب ان میں کاوش فکر اور اصابت رائے کی استعداد پیدا ہو جائے گی' وہ ہماری ان تلخ نوائیوں کو شاید زیادہ ناخوشگوار یا حقیقت سے دور نہ پائیں گے۔ شعرو شاعری ہو یا مضمون نگاری اس کے لئے مخصوص ذوق اور رجحان کی ضرورت ہے اس میں شک نہیں کسی حد تک اس کی تلافی مشق و مزاولت سے بھی ہو جاتی ہے لیکن اس فن کا کمال اکثر انھیں لوگوں کے حصہ میں آتا ہے جو اس کا ذوق ازل سے لیکر آتے ہیں۔ اس لیئے ہم اس وادی میں قدم رکھنے کی صرف اُن لوگوں کو صلاح دینگے جو اس کی استعداد فطرت سے لے کر آئے ہیں۔ ہر شخص کے لیئے ضروری نہیں ہے کہ وہ شاعر یا مضمون نگار ہو۔ دنیا کے دوسرے کام' بہت ممکن ہے' وہ زیادہ کامیابی اور خوش اسلوبی سے انجام دیسکے بعض لوگ اس طرف محض اس وجہ سے مائل ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا۔ اُردو کی خدمت یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ جو لوگ اس کے اہل نہ ہوں وہ اس کو اپنی حالت پر چھوڑدیں۔ بہ ایں ہمہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارے بعض طلباء ایسے ہیں جو اپنی

ادنیٰ توجہ سے اُردو کو کہاں سے کہاں پہونچا سکتے ہیں ان کے لیئے ضرورت ہے کہ وہ اُردو کی خدمت کو اپنے اوپر ایک قومی فرض تصوّر کریں۔ اُن کی نظر سے فارسی، عربی، انگریزی کی بہترین کتابیں گزرتی ہیں، بہترین لوگ اُن کے ادبی ذوق کی رہبری کرتے ہیں، بہترین ذرائع اور وسائل اُن کو حاصل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اُردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ پیش نہ کرسکیں۔ ان کو نہیں معلوم ہے اُردو کا مورّخ جس وقت موجودہ اور گزشتہ حالات اور واقعات کا جائزہ لیگا اس کی ہر جنبش قلم سے وہ نقوش برآمد ہوں گے جو ہمارے طلبا اور ہماری یونیورسٹی کو آیندہ نسلوں کے سامنے ہمیشہ کے لیئے نیک نام یا بدنام کردیں گے۔ ہم اپنے عزیز طلبا کو مشورہ دینگے کہ وہ اپنے مضامین کو سہیل کے اوراق میں دیکھنے سے زیادہ اس بات کے کوشاں رہیں کہ ان کا یہ علمی رسالہ اپنے بار امانت سے پورے طور پر کامیابی کے ساتھ سبکدوش ہو۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے ممکن ہے، بعض طبائع کی بدگمانی کا باعث ہو اور یہ نتیجہ نکالا جائے کہ ہم

اپنے طلبا کی ہمت شکنی پر آمادہ ہیں۔ یہ خیال لغو بھی ہے اور خطرناک بھی۔ ہم کو اگر یہ امید نہ ہوتی کہ اس رسالہ کی کامیابی کا مدار صرف اس پہ ہے کہ ہر ممکن ترتیب اور تہذیب میں ہمارے طلبا حصہ لیں تو شاید ہم اس بار گراں کو اختیار کرنے میں اتنے جری نہ ہوسکتے۔ ہمارے بعض موجودہ اور گذشتہ طلبا اردو کے لیئے ہر زمانہ میں مایۂ ناز رہے ہیں اور ہم کو امید ہے اردو کا تابناک مستقبل علی گڑھ سے وابستہ ہے اور رہے گا۔ ہم اپنے طلبا کے مضامین کو سر آنکھوں پر لینے کے لیئے آمادہ ہیں۔ اگر ہم کبھی اس کی خلاف ورزی کریں تو ان کو یقین کرنا چاہیئے یہ اس بنا پر نہ ہوگا کہ ہم ان کو کم عزیز رکھتے ہیں بلکہ اس کا باعث محض یہ ہوگا کہ ہم کو سچائی زیادہ عزیز ہوگی۔

"داشتہ آید بکار" لیکن یہ ساری داستان سرائی نامکمل اور ایک حد تک خطرناک رہ جائیگی اگر اس کے ساتھ ساتھ آخر میں ہم ایک واقعہ کا بھی تذکرہ نہ کر دیں۔ عرصہ ہوا ہمارے بزرگ مکرم عبد المجید صاحب قریشی پرنسپل انٹرمیڈیٹ کالج نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا تھا جو اب تک باوجود کوشش کے بھلایا نہ جاسکا۔ ان

کے ایک مسلمان تعلیم یافتہ دوست نے مسلمان والدین کے لیئے ایک بسیط مضمون لکھا اور شائع کیا تھا جس میں ارکان دین وغیرہ کی پابندی پر نہایت شد و مد کے ساتھ زور دیا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد قریشی صاحب اور ان کے دوست اتفاقاً اسی مسئلہ پر گفتگو کرنے لگے۔ دوست نے جو کچھ لکھا تھا۔ اس کے خلاف خود ان کے خاندان کا رویہ تھا۔ قریشی صاحب نے گھبرا کر ان کے مضمون کا حوالہ یا واسطہ دیا تو یہ مسکت جواب ملا:-

"اور مضمون نگار کو مسلمان سمجھنے کے لیئے آپ سے کس نے کہا تھا!"

قریشی صاحب کچھ ایسے چپ ہوئے کہ شاید اب اس واقعہ سے بھی انکار کریں!

اِس طوفان تکلم کے سلسلہ میں اندیشہ ہے کبھی راقم الحروف کو بھی اسی قسم کا جواب نہ دینا پڑے!

پیام نوجوان علی گڑھ کے نام

نوجوان علی گڑھ ایک بار پھر اُردو کی خدمت پر آمادہ ہوا ہے۔ نوعمری کا جوش، کام کا حوصلہ، کارگزاری کا ولولہ خدا ہمت میں بلندی، اور ارادہ میں استقامت نصیب

کرے۔ علم و حکمت کا درس جاری، ادب و انشاء کی گرم بازاری، قلم شوخ نگاری پر آمادہ، زبانیں شگفتہ بیانی پر مستعد، یارانِ زندہ دل کی مجلس آراستہ، ایک گوشہ نشین مردہ دل دہقانی کو حکم پہنچتا ہے کہ اپنے عزلت کدہ سے نکل کر اس بزم میں حاضری دے!

زبان حیران کہ کس موضوع پر کھلے! تاہم اگر فرصت بالکل عنقا نہ ہوتی تو دل میں تھا کہ خود علی گڑھ ہی کی بھولی بسری کہانی، چند کو ہنسانے والی، بہتوں کو رلانے والی، کسی کے دل میں جوش پیدا کرنے والی اور کسی کے تیور پر بل ڈالنے والی داستان دانشگاہ کے دیرینہ سال بزرگوں اور کمسن خردوں، سکھانے والے اُستادوں اور سیکھنے والے شاگردوں، سب کو ٹوٹے پھوٹے لفظوں اور اکھڑے اکھڑے فقروں میں سنا دی جاتی۔ ممکن تھا کہ کوئی کہانی سنتے سنتے سو جاتا، اور ممکن تھا کہ کسی کی نیند اڑ جاتی! لیکن فرصت عنقا، مجبوراً محض معذرت نامہ پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ مختصراً صرف دو لفظ کہہ دیتے ہیں۔

سید آحمد خاں (اللہ ان کی تربت کو ٹھنڈا رکھے) کی مذہبی و تعلیمی تحریکات سے متعلق اختلاف رائے ہمیشہ

رہا ہے اور شاید آیندہ بھی رہے، لیکن ان کی ایک خدمت ایسی ہے جس میں شاید کسی کو اختلاف کی گنجایش نہ ہو، اور وہ ان کی خدمت ادب و زبان اردو ہے۔ اُن کی ادبی تحریک نے اُردو نثر و نظم دونوں میں اصلاح ہی نہیں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور آج ادبیات اُردو کا جو کچھ سرمایہ نظر آ رہا ہے، ذرا مبالغہ نہیں کہ وہ بہت بڑی حد تک سید اور اُن کے رفقا ہی کی کوششوں کا شرمندہ احسان ہے۔ سرسید کے مضامین و تصانیف نے کہنا چاہیے کہ رفتار اُردو کا رُخ ہی پلٹ دیا، اور جو زبان پہلے "تکلف، تصنع و آورد کی ایک چیستان تھی" اسے سادہ سلیس، و بے تکلف روزمرہ میں ڈھال دیا۔ سرسید کے زمانہ کے قبل کی اردو تصانیف کو پڑھا جائے، اور پھر محمد حسین آزاد، نذیر احمد حالی، شبلی، شرر اور مابعد کے اہل قلم کی تحریروں سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو بین فرق ہر شخص کو نظر آ جائے گا، اور اس کا اجر اگر سارے کا سارا نہیں تو کم از کم ایک بڑا حصہ یقیناً میکشان علی گڑھ کے اسی "پیر مغاں" کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہے گا۔ علی گڑھ کا سب سے بڑا کارنامہ اور سید احمد خاں کا سب سے بڑا وزنۂ

میرے نزدیک یہی ہے۔ مبارک ہیں وہ فرزندانِ علی گڑھ جنھیں اس ورثہ کو حاصل کرکے اس میں اضافہ کرنے کی توفیق نصیب ہو!

لیکن یہ یاد رہے کہ علی گڑھ سب سے پہلے مُسلم کالج اور اسلامیہ دارالعلوم ہے مسلم کا کام محض لفاظی و لفظ تراشی نہیں مسلم کی زندگی کا مقصد اقلیم معنی کو سر کرنا ہے ہم وہ ہیں جن کو یہ تعلیم دی گئی ہے۔ ع:-

لفظ بگزاری سوئے معنی روی

الفاظ قالب و پوست ہیں نہ ہو کہ ہم قالب و پوست کی جانب اس درجہ منہمک رہیں کہ مغز ہاتھ سے جاتا رہے معنویت وحقیقت ہی ہمارا اصل مقصدِ حیات و مطلوب ہے الفاظ اس مطلوب کے لئے محض لباس و پوشش کا حکم رکھتے ہیں۔ لباس کی خوشنمائی و دل آویزی بھی۔ بجائے خود ضروری ہے۔ لیکن اسی حد تک کہ جسم زیر لباس کو اذیت نہ پہونچنے پائے۔ عجمی و فرنگی شاعری بہت وقت ضائع کرچکی ضرورت ہے کہ حقیقت حجازی کی جانب پھر رجوع کیا جائے۔ دنیا میں شاعر و ادیب اب تک بیشمار پیدا ہو چکے ہیں لیکن آج زندہ صرف وہی ہیں جن میں معنویت کی روح موجود تھی! سرسید کی دوررس نظر اس نکتہ پر تھی اور اسلیئے وہ آج زندہ ہے۔

(عبدالماجد)

۲

دسمبر ۱۹۲۵ء کے آخری ہفتہ میں جشن جوبلی منعقد ہوا، ملک و ملّت کی مختلف مجالس نے جلسے کئے تقریریں ہوئیں، تجاویز پاس کی گئیں، اس سلسلہ میں شکایت و حکایت کا مرحلہ بھی گزر گیا۔ اور اب جب کہ فضا میں ایک گونہ اعتدال ہے ہم کو گزشتہ کارنامہ کا جائزہ لے لینا چاہیئے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جہاں تک مجمع یا آرائش و تزئین کا تعلق ہے جشن جوبلی کامیاب رہا۔ لیکن بقول بعض احباب دیکھنا یہ ہے کہ اس سارے ہنگامہ جد و جہد سے ہمارا مستقبل کس حد تک برافگندہ نقاب ہوا اور ہماری منزل مقصود کہاں تک متیقن یا متعین ہوئی۔ ہم کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ جہاں تک مسلمانوں کی تعلیمی

جد و جہد یا نصب العین کا تعلق ہے پچھلا پنجسالہ دور (ترک موالات) کچھ ایسا رہا ہے کہ جوبلی میں جو کچھ نظر آیا وہ بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا علی گڑھ کی آواز پر ہر گوشۂ ملک سے صدائے لبیک بلند کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ علی گڑھ کی آواز میں اب بھی جاذبیت ہے اور

از قبیلۂ مجنوں کسے نماند

کا اندیشہ صحیح نہیں ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ جس طور پر علی گڑھ نے خوابیدہ یا مضمحل قوتوں کے بیدار کرنے میں پیش قدمی کی ہے۔ اسی طور پر اب اس پر یہ پابندی بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ ان قوتوں کو صحیح راستہ پر لگانے میں بھی اپنی ہمت اور قوت عمل کا ثبوت دے، جو بلی سے زیادہ ذمہ دار فریضہ جوبلی کے اثرات کو مفید اور پائدار بنانا ہے۔

اُردو کانفرنس، مسلم پریس کانفرنس، اُردو کمیشن اور سہیل اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، اُردو کی نشر و اشاعت علی گڑھ کا

امتیازِ خصوصی رہا ہے، علی گڑھ نے پچھلے پچاس ساٹھ سال میں اردو کی جو خدمات کی ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں ہیں موجودہ حالات کے ماتحت انجمن اُردوئے معلی نے اسی مقصدِ مہمہ کی تکمیل کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے اس میں شک نہیں جس عالی شان پیمانہ پر اب تک اس مقصد کی سربراہی میں مشاہیر علی گڑھ نے حصہ لیا ہے وہ ہمارے محدود ذرائع اور وسائل سے ابھی دور ہے بایں ہمہ جہاں تک ہم سے ممکن ہو سکا ہے ہم نے کسی قسم کی جد و جہد سے دریغ نہیں کیا ہے۔ موجودہ ہندو مسلم نفاق نے ہماری دقتوں کو پیچیدہ اور سنگین تر بنا دیا ہے۔ اصل میں موجودہ کشاکش اُردو اور ہندی کی نہیں بلکہ ہندو مسلمانوں کی ہے آج ملک کے بعض بہترین افراد اس ناخوشگوار حالت سے متفکر اور اس کے ازالہ یا انسداد میں سرگرداں ہیں۔ لیکن بدنصیبی سے فریقین اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کرتے کہ ہندوستان کے موجودہ دورِ محکومی میں کسی متنازعہ فیہ مسئلہ کا تصفیہ اس طور پر نہیں ہو سکتا کہ ایک فریق کلیتہً غالب اور دوسرا کلیتہً مغلوب قرار دیا جائے۔ تصفیہ وہی بہترین ہوتا ہے جس میں فریقین خود ایک دوسرے پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر

فیصلہ صادر کریں اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ کسی تیسری جماعت کا فیصلہ کہاں تک قابل پذیرائی ہے۔ ہر معاملہ میں حکومت کی پناہ ڈھونڈھنا اس بات کی دلیل ہے کہ کسی فریق کو اپنے دعوے کی صحت وصداقت کا یقین نہیں ہے۔ یہاں مختلف سیاسی اور مذہبی مسائل کو چھیڑنا مقصود نہیں ہے۔ ہم کو صرف اُردو اور ہندی کے مسئلہ کو اس نظریہ کے تحت میں جانچنا چاہیئے۔ ہندو ہندی کیلئے اور مسلمان اُردو کے لئے سربکف ہیں تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اُردو کے لئے بے قرار ہوں اور ہندو ہندی کے لئے بے چین نہ ہوں۔ ہندوستان کو دونوں کی ضرورت ہے اور ہندوستان کی فلاح ان دونوں کی ترقی سے وابستہ ہے۔ یہی نہیں ہندوستان میں جتنی زبانیں ہیں سب کو اپنی اپنی جگہ پر قائم رکھنا ہے اور ان کی ترقی ہر ہندی اور اردو داں کے پیش نظر ہونا چاہیئے۔ زبان کا فیصلہ بزور بازو آج تک نہیں ہوسکا ہے بالخصوص موجودہ دور میں جب حریت ومساوات کے جذبہ نے کتنے

ذرۂ افسردہ کو ہم رنگ شرار

بنادیا ہے' انگریزی کو جو وسعت یا وقعت آج نصیب ہے

وہ موجودہ رہنمایانِ ہندی یا اُردو کی ذہنیت پر کاربند ہونے سے حاصل نہیں ہوئی ہے، ضرورت اس کی ہے کہ ہم خود اپنے علم و عمل سے اردو یا ہندی کو ایسا فروغ دیں کہ اس کی حیثیت مسلم ہو جائے اور ہندو یا مسلمان نہیں بلکہ دنیا ان دونوں زبانوں کی یا ان میں سے کسی ایک کی جامعیت کو تسلیم کرے۔

لیکن اس قسم کے علمی یا اخباری مباحثے اب بالکل بے سود ہیں، وقت آگیا ہے کہ ہم آیندہ انفرادی یا باہمی جدو جہد کا پروگرام مرتب کریں اور اس بات کی کوشش کریں کہ ہندو اور مسلمان دونوں باہمی طور پر زبان کے مسئلہ پر متفق ہو جائیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک جگہ مل کر یہ طے کرلیں کہ اُردو اور ہندی کے مسئلہ میں ہماری نیت یا نظریئے کیا ہیں۔ انجمن اُردوے معلیٰ نے اس سلسلہ میں چند استفسارات شائع کئے تھے جن کے جوابات ایک رپورٹ کی شکل میں اُردو کانفرنس میں پیش کئے گئے تھے۔ اور منظور کئے جا چکے ہیں۔ "روئداد اُردو" جو ان سوالات و جوابات کا مجموعہ ہے اس حیثیت سے ایک نہایت اہم اور مفید تالیف

ہے کہ اس میں اردو کی توسیع و اشاعت کے متعلق ملک کے بعض بہترین افراد کے خیالات و تجربات پیش کئے گئے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے بیک نظر دریافت کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت اُردو کی کیا حالت ہے، اس کی نشر و تعمیم کس طور پر ہو سکتی ہے اور اس کا مستقبل کیسا ہے؟ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے ہندو مسلمان اصحاب کا ایک جلسۂ شوریٰ کیا جائے جو اُردو سے دلچسپی رکھتے ہیں اور جن کے تجربے اور کارنامے اُردو کے حق میں مفید ثابت ہوئے ہیں۔ جوبلی کے موقعہ پر جو اُردو کانفرنس ہوئی تھی اس میں اس قسم کی تجویز کو پیش کرنے کا موقع نہ ملا اور نہ مل سکتا تھا۔ اس وقت ضرورت اس کی تھی کہ ہم جو کچھ سوچ چکے ہیں اور اُردو کے حق میں جو کچھ مفید سمجھتے ہیں اس سے عام طور پر لوگوں کو آگاہ کردیں۔ وہ مرحلہ اب گزر چکا ہے اور دوسری منزل ہمارے سامنے یہ ہے۔

انجمن دارالمصنفین اعظم گڑھ کی تجویز[1]

---

[1] ملاحظہ ہو سہیل بابت ماہ جنوری صفحہ ۸۷

"اُردو کے ہمدردوں اور ہندی کے حامیوں کا ایک مشترک مشورہ کا جلسہ ہو اور اس میں اس اردو اور ہندی کی بحثوں کے متعلق ہمدردی اور نیک نیتی کے ساتھ گفتگو اور سمجھوتہ ہو اور معلوم کیا جائے کہ وہ ہندی سے کیا مراد لیتے ہیں؟ اور ہم اُردو کو کیا سمجھتے ہیں؟ کیونکر دونوں قومیں ایک زبان کے پلیٹ فارم پر جمع ہوسکتی ہیں اور دونوں کے پاس اپنے اپنے دعوے کی کیا دلیلیں ہیں۔"

انجمن ترقی اُردو کی صلاح یہ ہے[1]:-

"اگر مسلم یونیورسٹی یا اس کی انجمنیں اُردو زبان کے متعلق کمیشن قائم کرکے رپورٹ نہیں تیار کرا سکیں تو پھر اور کس جماعت سے یہ توقع کی جاسکتی ہے؟ ...... اگر آپ یہ نہیں کرسکتے تھے کہ ایک کمیشن قائم کرتے جو ملک کے مختلف صوبوں میں گشت لگاتا اُردو کی توسیع و ترقی اور موجودہ حالت اور اس کے متعلق تمام ضروری مسئلوں کی تحقیق کرتا اور بعد کامل غور و فکر کے اپنی رپورٹ پیش کرتا تو آپ کم

---

[1] ملاحظہ ہو سہیل بابت ماہ جنوری صفحہ ۹۳

سے کم یہی کرتے کہ چند ایسے بے ریا اور مخلص ہندو
مسلمانوں کو جمع کرتے جو اردو زبان کی حالت اور
حقیقت سے واقف ہیں اور ان مسائل پر رائے دے
سکتے ہیں اور ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کرتے کہ
اردو زبان ملک کی مقبول اور مشترک زبان ہو سکتی
ہے یا نہیں .. .. .. یقین ہے کہ اس بارے میں
ایسے ہندو اصحاب کی رائے جو اُردو کے ادیب اور
اُردو کے بہی خواہ ہیں زیادہ قابل وقعت ہوگی .....؟"

جہاں تک مسلمان اُردو داں طبقے کی نیت یا ذہنیت کا تعلق ہے دار المصنفین اور انجمن ترقی اُردو کی مندرجہ بالا آرا قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہیں، راقم الحروف نے استفسارات مطبوعہ میں ہندو بزرگوں سے خاص طور پر گزارش کی تھی کہ وہ اس اُردو ہندی مسئلہ کے بارہ میں ہماری رہبری فرمائیں لیکن افسوس ہے باوجود چند در چند معروضات کے ہم کو ان کی تجاویز و آرا سے مستفید ہونے کا موقع نہ مل سکا بایں ہمہ اس سلسلہ میں محترمی دیا نراین نگم صاحب (مرتب رسالہ زمانہ کان پور) نے وقتاً فوقتاً جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ہمارے لئے

نہایت امید افزا ہے۔ بیگم صاحب کی اردو خدمات مسلم ہیں اور ہم کو امید ہے وہ اور ان کے ہم مذہب و ہم خیال موجودہ تحریک میں اپنے قیمتی مشورہ اور عملی اعانت سے ہم کو محروم نہ فرمائیں گے اور اپنے اس خیال کو کہ

"مشترکہ زبان تسلیم کرنے کے لئے گورنمنٹ کے التفات سے زیادہ باہمی مفاہمت و صلح کوشی کی ضرورت ہے"۔

کا عملی ثبوت پیش فرمائیں گے۔

بہر حال ہندی اُردو کا مسئلہ اس وقت جیسی نازک صورت اختیار کر رہا ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے ہر محب وطن کا فرض ہے کہ وہ اس کے معقول تصفیہ میں کسی امکانی کوشش سے دریغ نہ کرے۔ مسلمانوں کی طرف سے ہم ہر ایسے جلسۂ شوریٰ میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہیں جس میں فرقہ وارانہ پاسداری کو عام مفاد کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت دی جائے اور صرف شریک ہونے ہی کے لئے آمادہ نہیں ہیں بلکہ اس جلسہ کے مدعو کرنے اور کامیاب بنانے کی جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں اس کو برداشت کرنے کے لئے بھی حاضر ہیں اس قسم کی مشاورتی مجلس کے ابتدائی

مدارج طے کرنے کے لئے فی الحال ایک کمیٹی قائم کرنی چاہیئے جو نمایندوں کا انتخاب کرے اور وہ حدود متعین کرے جن کو مد نظر رکھکر ہم مسائل متنازعہ فیہ پر تبادلہ خیالات کے لئے جمع ہوں۔ انجمن اُردوے معلیٰ کی مجلس عامہ کا ایک جلسہ عن قریب منعقد ہوگا۔ جس میں اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف امور پر بحث ہوگی۔

دیسی زبانوں کو ترقی دینے میں جہاں بہت سے فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں وہاں بعض حیثیات سے حکومت کی سرپرستی وہمدردی کا حاصل کیا جانا ازبس ضروری ہے' دیسی زبانوں کے ہمدردوں کے لئے یہ خبر یقیناً نہایت امتنان بخش ہے کہ اس سلسلہ میں صوبۂ متحدہ کی حکومت نے بعض نہایت اہم اور ضروری امور کی طرف توجہ کی ہے اور یہ اب ہمارا فرض ہے کہ حکومت نے جس راستہ کی طرف قدم بڑھایا ہے ہم اس کو اس راستہ پر مزید سرعت اور استقلال کے ساتھ رہنموں رہنے کے لئے مہمیز کرتے رہیں۔ ذیل کا اقتباس ہم رسالہ زمانہ کانپور بابت ماہ جنوری ۱۹۲۶ء سے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

"صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی قانونی کونسل نے پنڈت

یگ نراین صاحب اپا دہیاے ام ال سی کی تحریک پر ایک لاکھ روپیہ ہندی اردو لٹریچر کی توسیع و ترقی کے لئے منظور کیا ہے۔ اس رزولیوشن کے مباحثہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے وزیر تعلیمات صوبہ راجیشور بلی صاحب بھی ضروری کتابوں کے ترجمہ کے لئے صوبہ میں ایک بورڈ قائم کرنے کی فکر میں ہیں اور انھوں نے اس بارہ میں بعض اہل الرائے اصحاب سے مشورہ بھی کیا ہے۔"

ہم وزیر تعلیمات کی اس علم دوستی اور وسیع النظری پر مبارکباد پیش کرتے ہیں صوبہ متحدہ کی قانونی کونسل میں اس قسم کی تجویز ایک نیک فال ابتدا ہے۔ یہاں یہ سوال فطری طور پر رونما ہوتا ہے کہ اس رقم کا صحیح مصرف کیا ہوگا "ضروری کتابوں" کی نوعیت متیقن کرنا فی الحال اتنا ہی مشکل ہے جتنا یہ غیر موزوں اور شاید اندیشہ ناک بھی ہے' موجودہ حالت میں بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ وزیر تعلیمات کی صدارت میں ہندی اردو ماہرین خصوصی کا ایک جلسہ ہو جس میں اس قسم کے صحیح مصرف کا فیصلہ کیا جائے۔ موجودہ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے حسب ذیل

امور خصوصیت کے ساتھ قابل لحاظ ہیں۔

ا۔ ایک نمائندہ اور موقر اکیڈمی قائم کی جائے جو حسب ذیل امور کی نگراں ہو

(الف) سرکاری مدارس کے لئے ملکی و قومی روایت و مفاد کو مدنظر رکھکر کتب درسی کی تالیف و تدوین۔

(ب) انڈیا آفس لائبریری کے نوعیت و پیمانہ کی دیسی کتابوں کا ایک مکمل کتب خانہ

(ج) علمی رسائل و اخبارات کی مالی امداد اور علمی انجمنوں کی سرپرستی

(د) صوبہ متحدہ کے بہترین مصنفین و مولفین کی ان کے علمی کارناموں پر ہر سال معقول انعامات و خطابات سے ہمت افزائی کرنا۔ صوبہ پنجاب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

(ھ) مشہور تصانیف کا ترجمہ

(و) جس طور پر حکومت کی طرف سے اس وقت عربی اور سنسکرت کی دو چیر (ادارے) قائم ہیں اسی طرح اردو اور ہندی کے بھی دو ادارے قائم کئے جائیں۔

(مز) ممالک متحدہ میں ہندی اور اُردو کے دو کالج
قائم کئے جائیں جن کے کامیاب شدہ طلبا کو
وہی سہولتیں اور حقوق حاصل ہوں جو انگریزی
کالجوں کے طلبا کو حاصل ہیں

آخر الذکر تجویز سے گھبرانے کی وجہ یوں بے بنیاد ہے کہ اس قسم کا کالج ہی نہیں بلکہ ایک یونیورسٹی (عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن) آج قائم ہے اور کامیاب ہے اور اس کی حیثیت کو ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے تسلیم کرلیا ہے۔ اس میں شک نہیں اس کی ابتدا ایک لاکھ روپیہ کی رقم سے نہیں کی جاسکتی' لیکن ہم کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے حکومت نے صیغہ تعلیمات کو "صیغہ منتقلہ" کی حیثیت دے کر ہمارے لئے بعض معقول سہولتیں پیدا کر دی ہیں اگر ہم جرأت اور استقلال کے ساتھ اس تحریک کو شروع کریں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جلد یا بدیر اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو' ہمارا خیال ہے دیسی زبانوں کی اشاعت کے لئے ہندو مسلمان محاصل ادا کنندگان ایک مختصر و مزید ٹکس ادا کرنے پر بخوشی رضامند ہو جائیں گے۔

(مح) اکیڈمی کا سہ کاری علمی ماہی رسالہ

یہاں یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ جن امور کا مد نمبر (الف) اور (د) میں تذکرہ کیا گیا ہے اگر ان پر آج حکومت فیاضی اور خلوص کے ساتھ عمل کرنے پر آمادہ ہو جائے تو بہت سے ان نقائص کا ازالہ ہو جائے جن کے خلاف ہندوستانی رہبروں کی ایک جماعت عرصہ سے بر سرِ پیکار نظر آ رہی ہے' سرکاری مدارس کے خلاف ترک موالات کے سلسلہ میں جو واقعات پیش آئے ان پر تحمل و اعتدال کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی کہ سرکاری مدارس کا موجودہ نصاب ہندوستانی طلبا کے لئے موزوں نہیں ہے۔
ایک طرف تو یہ کتابیں ملکی اور قومی ذہنیت کے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ دوسری طرف غیر ملکی زبان کے حاصل کرنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان سے عہدہ بر آ ہونا دشوار ہے۔ یہ دشواریاں اور نقائص تو بجائے خود ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ بھی دیکھا گیا کہ حکومت نے دیسی زبانوں کی ترقی اور اشاعت میں کافی سیر چشمی سے کام نہیں لیا اور ان زبانوں کی زندگی بڑی حد تک غیر سرکاری یا نیم سرکاری مساعی کی رہین منت رہی ہیں اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت نے جس تالیف قلوب کا سامان مہیا

کیا ہے اس سے بہترین طور پر مستفید ہونے کے لئے ہم (اور اس میں حکومت متحدہ کا صیغہ تعلیمات بھی شامل ہے) صرف ضابطہ کی خانہ پڑی پر اکتفا نہ کریں بلکہ مزید سعی وکاوش کو برسر کار لاکر اس میں ایسی استواری پیدا کردیں کہ یہ تحریک اپنی خوبیوں کے اعتبار سے کامیاب کہے جانے کی مستحق ثابت ہو

مسلم اُردو پریس کانفرنس کے سلسلہ میں جو کارروائی ہوئی وہ اس اعتبار سے ضرور قابل لحاظ تھی کہ اس زمانہ میں شریفی اور سعودی مناقشات نے جو صورت اختیار کرلی تھی اس کا ردعمل بھی جلد سے جلد شروع ہوجاتا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مسلم پریس کانفرنس منعقد ہوئی، مختلف اخبارات کے نمایندے شریک ہوئے، لیکن جیسا دیگر مجالس کو پیش آیا پریس کانفرنس کو بھی اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے کا وقت اور موقع نہ ملسکا جو بلی کی آخری تاریخیں تھیں محفل برہم ہونے لگی تھی اور لوگ چاہتے تھے کہ کس طور پر جلد سے جلد سارے مراسم ختم ہوں۔ باعتبار نوعیت پریس کانفرنس کے مقاصد نہایت اہم تھے اور ضرورت تھی کہ ان مقاصد کے ہر پہلو پر غور کرکے ایسا لائحہ عمل مرتب کیا جاتا جو ہر طور پر قابل عمل اور قابل

قبول ہونا۔

لیکن ایسا نہ ہوسکا اور صرف چند ایسے رزولیوشنوں پر اکتفا کرلیا گیا جن کے پاس کرنے کے لئے اتنے مہتم بالشان موقع کی تلاش بے سود تھی' کانفرنس کے سامنے سوال یہ نہ تھا کہ سرکاری سمن اور نوٹس کہاں اور کیوں کر شائع ہوں یا مختلف قومی انجمنوں کی روئداد بلا معاوضہ نہ شائع کی جائیں سوال یہ تھا کہ موجودہ حالات کے ماتحت جب اردو یا ہندی پریس کی کوئی وقعت نہ تھی اور نہ ان کو عام طور پر قابل اعتنا تصور کیا جاتا تھا' جب ان کا لب و لہجہ قابل اعتراض حدود تک پہنچ چکا تھا' جب ان میں کوئی ہمدردی اور یگانگت باقی نہیں رہ گئی تھی جب اس کو محض ذریعۂ معاش قرار دیدیا گیا تھا کیا ذرائع اور وسائل عمل میں لائے جائیں کہ صورت حال میں امید افزا تبدیلی پیدا کی جاسکے۔ یہ سب کچھ

نشستند و گفتند و برخاستند

سے نہیں طے ہوسکتا تھا۔ ضرورت اس کی تھی کہ اس کا لائحہ عمل پہلے سے طیار کرلیا جاتا' کوشش کی جاتی کہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے مسلمان اردو اخبار نویس اس میں شریک ہوتے اور اس کانفرنس کے متفقہ فیصلہ کی پابندی کا لحاظ رکھا جاتا

ماتم صرف مسلمان اردو اخبار نویسوں کا نہیں ہے،
ابھی حال میں راقم الحروف نے انجمن اُردوے معلیٰ کی طرف سے ایک گشتی مراسلہ شائع کیا تھا جس میں تمام اردو اخبار نویسوں سے خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں درخواست کی تھی کہ وہ اپنے اپنے صحائف ورسائل کے متعلق بعض ضروری معلومات انجمن کو روانہ فرمائیں۔ ان کی مخصوص ضروریات کی طرف عام لوگ کی توجہ مبذول کرائی جائے گی ان کے متعلق مختصراً اطلاعات برابر سہیل میں شائع ہوتی رہیں گی اس طور پر ممکن تھا کہ کسی نہ کسی وقت بہتری کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آتی یہ بھی درخواست کی تھی کہ اگر تمام امور مستفسرہ کا جواب دینا ناممکن ہو تو کسی ایک یا دو کا جواب مرحمت فرمائیں۔ یہ بھی ناممکن ہو تو صرف اپنے اپنے اخبار یا رسائل کا ایک نسخہ قیمتاً انجمن کو مرحمت فرمائیں ہم خود ضروری مواد اخذ کریں گے؛ لیکن افسوس ہے کہ ان معروضات پر بھی سوائے دو حضرات کے کسی نے التفات نہیں کیا، سوائے الفضل (قادیان) کے یا دو ایک گمنام اخبارات کے جو شاید اب تک بند بھی ہو گئے ہوں کسی نے نمونہ کی کاپی بھی مفت یا بہ قیمت بھیجنا گوارا نہ کیا!

سہل پسندی یا سہل انکاری کا یہ عالم ہو تو پھر کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ ہم کانفرنس یا اس قسم کی کسی دوسری انجمن یا طریقۂ کار کو مفید بنا سکیں گے۔ بایں ہمہ ہم پریس کانفرنس کی طرف سے مایوس نہیں ہیں اور ہم کو توقع ہے ہمارے بزرگ مکرم سید جالب صاحب دہلوی اور مولانا نظامی صاحب اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اپنی قیمتی خدمات اور تجربات سے کبھی دریغ نہ فرمائیں گے۔ مسلم اردو پریس کو چاہیئے کہ اس مسئلہ کو اپنے اپنے اخبارات میں چھیڑ کر ایک مخصوص نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ اردو پریس کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور اس کا سبب پبلک کا تبدل میلان یا مذاق نہیں ہے بلکہ یہ خود ہمارے پریس کی پیدا کی ہوئی خرابیاں ہیں جس کے ازالہ کی ذمہ داری بھی اردو پریس ہی کے ذمہ آتی ہے

بے موقع نہ ہوگا اگر ہم یہاں ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق بھی بعض ہمدردانِ قوم اور ماہرانِ تعلیم کے خیالات کی ترجمانی کریں۔ کانفرنس تقریباً اپنا پچپن سالہ دور ختم کر چکی ہے اور اب ضرورت اس کی ہے کہ اس کے لائحہ عمل پر نظر ثانی کی جائے کانفرنس کے ابتدائی مقاصد میں مسلمانوں کو اعلیٰ

تعلیم کی ترغیب دلانا اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانا تھا، اس کے علاوہ اور مقاصد بھی تھے جن کے تفصیل کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ہی نہیں بلکہ دوسری اقوام بھی اعلی تعلیم سے پورے طور پر بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ضرورت سے زیادہ باخبر یا مستفید ہو چکی ہیں، مدرسۃ العلوم بھی مسلم یونیورسٹی کے حدود تک پہنچ چکا لیکن خواندہ مسلمانوں کی ابھی نہایت کمی ہے، صورت حال یہ ہے کہ مسلمان یا تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے یا کر چکے ہیں یا پھر جاہل محض ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم عام طور پر مقبول نہیں ہے۔ اب ضرورت اعلیٰ تعلیم یافتہ پیدا کرنے کی نہیں ہے بلکہ تعلیم کو عام بنانا ہے ابتدا میں بانیانِ کانفرنس کا مقصد مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم دے کر گورنمنٹ کی اعلیٰ ملازمت کے قابل بنانا تھا وہ دور اب ختم ہو چکا ہے۔ حکومت کی اعلیٰ ملازمتیں، اعلیٰ تعلیم یافتوں کی تعداد سے کہیں کم رہ گئی ہیں، اس کے علاوہ قومی، سیاسی اور ملکی پیچیدگیاں اس کے راستہ میں حائل ہو گئی ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ اب مسلمانوں کو ایک باعزت وسیلہ معاش کے لئے نئے راستوں کی طرف مائل کیا جائے۔ اس کی صورت صرف

یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کو عام بنایا جائے اس وقت ہمارے سامنے حسب ذیل ضروریات ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے ہم کو جلد سے جلد آمادہ ہو جانا چاہیئے۔

(۱) مسلمانوں کا طبقۂ ادنیٰ جو جاہل محض ہے خواندہ بنایا جائے۔

(۲) اردو کی توسیع و اشاعت

(۳) ملازمت کے علاوہ کوئی اور طریقہ معاش جو مسلمانوں کے عام طبقے کو باعزت اور قانع زندگی بسر کرنے کے قابل بنا سکے مثلاً صنعت و حرفت، زراعت، کاریگری، تجارت وغیرہ

ان مقاصد کو کامیاب بنانے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہوگی

۱۔ سامان۔ ۲۔ کام کرنے والے۔

۳۔ ان دونوں سے لوگوں کی واقفیت۔

واقعہ یہ ہے کہ کانفرنس کو یہ سب باتیں میسر ہیں، سامان موجود ہیں، سرمایہ ہے، آفس اور ملازمین ہیں اور کانفرنس سے کم و بیش تمام ہندوستان کے لوگ واقف ہیں۔ صرف کام کی نوعیت بدل دینی ہوگی، جس طور پر ہر سال جہاں کہیں اجلاس ہونے والا ہوتا ہے، ایک یا دو ماہ پیشتر مقامی طور پہ کانفرنس کے ارباب حل و عقد یا ملازمین تگ و دو شروع کر دیتے ہیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں لوگ اس

سے باخبر ہوجاتے ہیں۔ اسی طور پر اب سال بھر ہر مقام پر تھوڑا بہت کام کرنا پڑے گا۔ صوبجاتی یا ضلع کی ایجوکیشنل کانفرنس کا مقصد اب اجلاس کرنا نہ ہوگا بلکہ ایک تعلیمی محکمہ کے طور پر مکتب و مدارس کھولنے اور چلانے ہوں گے۔ مرکزی کانفرنس کی پوزیشن وہی ہوگی جو حکومت کے محکمہ تعلیم کا ہوتی ہے۔

کانفرنس کے قائم کیے ہوئے مدارس اور مکاتب اب بھی موجود ہیں لیکن ان کی دیکھ بھال خاطر خواہ نہیں ہوتی اس کا سبب محض یہ ہے کہ کانفرنس نے اپنا مطمح نظران مکاتب و مدارس سے کہیں بلند رکھا ہے اور ان کو محض ثانوی حیثیت دے رکھی ہے اگر وہ اپنا نصب العین محض ابتدائی تعلیم کو عام بنانا قرار دے لے تو پھر یہ نقص باقی نہ رہے گا۔ اب تک کانفرنس کو سارے کام براہ راست خود کرنے پڑتے تھے اور جب میدان بہت وسیع اور کام مشکل ہو تو مرکزیت کبھی کامیاب نہیں بنائی جاسکتی کانفرنس کو اپنا کام نہایت وسیع پیمانہ پر تقسیم کردینا چاہیئے۔

مثال کے طور پر ہر ضلع کی کانفرنس کو اس ضلع کے حالات

اور واقعات کے فیصلہ کا اختیار دینا چاہیئے ضلع کانفرنس کے ارباب حل و عقد بھی اسی ضلع کے مشاہیر اور ہمدرد ہوں، جہاں تک ممکن ہو ہر ضلع کا خرچ بھی اسی ضلع سے وصول کرنا چاہیئے. مرکزی کانفرنس (علی گڑھ) کا فرض صرف یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان مقامات پر وہاں کے حالات کا اندازہ کرکے اپنی پالیسی نافذ کیا کرے۔ ضلع کی کانفرنس کا تعلق صوبجاتی کانفرنس سے ہو اور ہر صوبجاتی کانفرنس کا ایک نمائندہ مرکزی کانفرنس کی جماعت عاملہ کا ممبر ہو۔ اس طور پر مرکزی جماعت کو جزئیات کی کشاکش سے نجات ہو جائے گی اور کام نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ کانفرنس کو کوشش کرنی چاہیئے کہ ہر صوبے میں مسلمانوں کا ایک کالج ہو اور ہر شہر میں ایک ہائی اسکول، اگر ہائی اسکول ناممکن ہو تو کم سے کم ایک اسلامی دارالاقامہ ہر شہر میں ہونا لازمی ہے ہر بڑے قصبے میں ایک اسلامی مدرسہ اور ہر گاؤں یا قریہ میں اسلامی مکتب ہو، بظاہر یہ نظام نہایت وسیع اور

پیچیدہ معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ضلع اور صوبجاتی کانفرنس کا نظام عمل صحیح ہو اور جماعت انتظامیہ کا انتخاب بہتر ہو تو یہ ساری مشین اپنی اپنی جگہ پر مستقل طور پر چلتی رہے گی اور مرکزی جماعت کو صرف دیکھ بھال کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں ایک امر کی طرف ہم کو اپنی پوری توجہ مبذول کرنی چاہیئے اور وہ یہ کہ عام طور پر پرائیویٹ مدارس او مکاتب کے لئے اچھے استاد نہیں ملتے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس قسم کے ملازمین اپنے اپنے مناصب کو محفوظ نہیں سمجھتے، وہ سمجھتے ہیں، اور ان کا خیال ایک بڑی حد تک صحیح بھی ہے کہ ان کا وجود اور عدم وجود بعض مقامی شخصیتوں کے چشم و ابرو کے اشارہ پر ہے اس لئے وہ اپنے فرائض کی بجا آوری کے بجائے ان ہستیوں کی جا و بے جا پرستاری کو اپنا مقصد عین قرار دے لیتے ہیں۔ یہ صورت حال جتنی افسوس ناک ہے اتنا ہی صحیح بھی ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان کا عزل و نصب مرکزی جماعت عاملہ سے متعلق ہو، دوسری طرف بہتر کارکردگی پر ان کو ترقی بھی دینی چاہیئے، مالی ترقی کے علاوہ وقتاً فوقتاً ان کا تبادلہ بھی کرنا چاہیئے، اگر کسی خاص ضلع کے کسی ملازم کی شکایت ہو تو اسے کسی دوسرے

مقام پر تبدیل کر دینا چاہیئے۔ گورنمنٹ بھی ایسا ہی کرتی ہے اور اس سے جہاں بعض پیچیدہ معاملات رفت وگزشت ہوتے رہیں گے وہاں تعلیم کی فنی خوبیاں بھی ترقی کریں گی۔

اس اسکیم پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ جب ابتدائی تعلیم (محض نوشت و خواند) کی ترقی مدنظر ہے تو پھر ایسے نظام کی کیا ضرورت ہے جس سے اعلیٰ تعلیم کی ترقی کا منشا ظاہر ہوتا ہو، لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ ہمارا مقصد عین صرف ابتدائی تعلیم کو عام اور مقبول بنانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان لڑکوں کے لئے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں یا جن کو اعلیٰ تعلیم دلانا ضروری اور مفید ہو ان کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانا بھی مدنظر ہے اس مقصد کی بجا آوری کے لئے ہمارا نظام پورے طور پر مکمل ہونا چاہیئے۔ ہمارا مقصد صرف درسی تعلیم نہیں ہے بلکہ ہم ان کو ایک سچے مسلمان اور اچھے شہری ہونے کی بھی تعلیم دینا چاہتے ہیں اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہمارا مقرر کیا ہوا نصاب یا ہماری ہی قائم کی ہوئی روایات اور اس کے مطابق فضا نہ ہو۔ پھر اس مکمل نظام میں ایک ایک قسم کی جاذبیت ہوگی جس سے عام طور پر مسلمانوں میں

صحیح تعلیم پیدا کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور وہ سہولت کے ساتھ اپنی تعلیم کو تکمیل کے حدود تک پہنچا سکیں گے، کیا تعجب اگر کسی وقت مسلم یونیورسٹی کو الحاقی اختیارات اور سہولتیں حاصل ہو جائیں اس وقت ہمارے لئے بہت سی دقتیں سہل ہو جائیں گی۔

مسلمانوں کے سطوت و جبروت کی شمع ۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانہ میں سلطنت مغلیہ کے ساتھ گل ہوئی۔ ظاہر بین نظریں ان واقعات کا مطالعہ تاریخ کے صرف اُن اوراق میں کرسکی ہیں جن کی تصنیف و تالیف خاص مقاصد کو مدنظر رکھکر ہوئی ہے کہیں عہد مغلیہ کی بے عنوانی و بد نظمی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اور کہیں مغل سلاطین یا مسلمان حکمرانوں کی کمزوری اور دراز دستی کی داستان سنائی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ موجودہ عہد یا حکومت کو ایسے رنگ میں پیش کیا گیا ہے جس سے ان خرابیوں کے نقوش اور زیادہ نمایاں اور ابھرے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں یہاں ان امور سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے لیکن اس سارے ہنگامہ ترک و قبول میں ایک ایسی حقیقت پوشیدہ ہے جس کا بعض عمیق نگاہیں بھی اب تک اندازہ نہیں لگا سکی ہیں۔ اس وقت جب کہ کسی قوم یا عہد کے مخصوص حالات اور واقعات کا نفسیاتی تجزیہ کرنا ایک

نہایت اہم مسئلہ تصور کیا جاتا ہے نا مناسب نہ ہوگا اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اپنے بے پناہ رفتار خیالات کو روک کر بعض ان حقائق کا جائزہ لینے کے لئے آمادہ ہو جائیں جن کا ہم کو صرف اس لئے احساس نہیں ہے کہ اغیار نے ان کو یا تو ناقابلِ التفات سمجھ کر نظر انداز کر دیا یا خطرناک تصور کر کے ہاتھ لگانا مناسب نہیں سمجھا۔

تاریخ گواہ ہے جب کوئی قوم ترقی یا تنزل کے انتہائی مدارج طے کرتی ہوتی ہے اس وقت اس میں یگانۂ روزگار افراد پیدا ہو جاتے ہیں اور علم و عمل کے ہر شعبہ میں مافوق الانسان ہستیاں برسرِ کار نظر آنے لگتی ہیں۔ غدر کا زمانہ بھی اسی کرشمۂ فطرت کی ایک مثال ہے۔ اسلام کی پوری تاریخ پر نظر ڈالئے اور اس عہد سے ہم خلافت راشدہ کا دورِ مسعود حذف کرتے ہیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ اس اعتبار سے نہایت عجیب و اہم تھا کہ حکومت کے زوال پر مسلمانوں میں (دہلی اور مضافات دہلی کو خصوصیت کے ساتھ مدنظر رکھئے) متعدد نادرۂ روزگار ہستیاں بیک وقت نمودار ہوئیں اور یک لخت ختم ہوگئیں۔ سطوت

اسلامی کا یہ "سنبھالا" کتنا عجیب و کس درجہ عبرت ناک ہے۔
اک ذرا اس فہرست کا مطالعہ فرمائیے:-

۱۔ مفتی صدر الدین	منطق و معقول
۲۔ شاہ عبد العزیز علیہ الرحمۃ ..	مفسر و محدث
۳۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری رح ..	ادیب و عالم
۴۔ مفتی عنایت احمد علیہ الرحمۃ ..	عالم و مورخ
۵۔ مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی	عالم
۶۔ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری	محدث
۷۔ مولانا فضل حق خیر آبادی رح ..	منطق و معقول
۸۔ مفتی محمد لطف اللہ صاحب رح ..	عالم و محدث و مفسر و ادیب
۹۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی رح ..	منطق و ریاضی
۱۰۔ مولانا اسمٰعیل شہید رح	مجاہد
۱۱۔ مولانا سید احمد صاحب بریلوی ..	مجاہد
۱۲۔ مولانا محمود الحسن صاحب رح ..	مفسر و محدث و ادیب
۱۳۔ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی ..	منطق و فلسفہ
۱۴۔ مولانا عنایت رسول چریا کوٹی	ماہر لسانیات
۱۵۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رح۔	محدث و صوفی
۱۶۔ غالب	شاعر
۱۷۔ مومن	شاعر

یہ فہرست محض سرسری طور پر دیدی گئی ہے۔ اس گنج گرانمایہ میں کتنے دُرِ شاہوار ایسے ہوں گے جن کا نام سہواً نہیں دیا جاسکا یا بخوف طوالت نظر انداز کردیے گئے۔ اسی زمرہ میں ایک دوسری جماعت بھی آتی ہے جس نے "بادۂ کہن" کو "مینائے جدید" میں پیش کیا ہے۔

سرسید، حالی، نذیر احمدؒ، ذکاء اللہ، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، شبلی کو کون نہیں جانتا، اس عہد عافیت میں ہندوستان نے لیل ونہار کے کتنے پہلو بدلے ہیں لیکن پوچھے کوئی اس پایہ کی ہستی بھی پیدا کرسکا ہے یا مستقبل قریب میں اس کا امکان بھی ہے!

یورپ میں ہر عہد کی ہر قسم کی تاریخ ہے

۱۔ عہد جارجیہ

۲۔ عہد الزبتھ

۳۔ عہد وکٹوریہ وغیرہ

لکھنے والوں نے ان زمانوں کی ذہنی ونفسیاتی تاریخ لکھی ہے اور اس کمال وخوبی سے کہ اس عہد کے واقعات اور میلانات ہمارے سامنے آئینہ بن کر آجاتے ہیں۔ یورپ کو

یورپ بنانے والے وہاں کے واقعات نہیں بلکہ اس کے بے پناہ مورخ ہیں۔ واقعات کم وبیش ہر جگہ یکساں ہوتے ہیں۔ یہ صرف واقعہ نگار اور انشا پرداز ہیں جو ان واقعات کو زندہ مثال کی طور پر پیش کرتے رہتے ہیں اور اس طور پر قوم وملک کے خیالات ومیلانات زیر وزبر ہوتے رہتے ہیں۔

جس عہد کا ابھی تذکرہ کیا گیا ہے اس سے ہم قطعاً نا آشنا ہیں۔ انیسویں صدی کی آخر نصف صدی ایک ایسی تاریخ کی حامل ہے جو مسلمانوں کے لئے بہت بڑی دلیل راہ بن سکتی ہے۔ اس زمانہ کی تاریخ ذہنی مسلمانوں کے زبردست کمالات کی ترجمان ہے' ضرورت اس کی ہے.... کہ اس کا کام اعلیٰ پیمانہ پر شروع کیا جائے اور اس سلسلہ کی تمام تصانیف ایک خاص مقصد رکھکر طیار کی جائیں۔ بہترین اشخاص کا انتخاب کیا جائے اور ان کو کافی معاوضہ دیا جائے اور اس کی نگرانی ایک مقتدر مجلس کے سپرد کی جائے. جس طور پر مسلم یونیورسٹی نے تصانیف خسروی وغیرہ کا کام نہایت ہمت اور سیر چشمی کے ساتھ شروع کیا تھا اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اسی طور پر اس عہد کی ایک جامع تاریخ

کی طیاری کا انتظام ہونا چاہیئے۔ مسلم یونیورسٹی کی یہ کوشش اور پیش قدمی ایک نہایت مہتم بالشان علمی اور اسلامی کارنامہ ہوگا۔ ہم کو امید ہے اس مسئلہ پر انجمن دارالمصنفین بھی اپنے خیالات ظاہر کرے گی۔ محترمی سید سلیمان صاحب اس مسئلہ میں ماہر خصوصی کی حیثیت رکھتے ہیں کاش وہ اپنی چند در چند مصروفیتوں کے باوجود اس پر غور کرنے کا وقت نکال سکیں۔

جہاں تک مسلم یونیورسٹی کا تعلق ہے ہم جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ جس طور پر "گبس میموریل سیرز" کی کتابیں شائع ہوئی ہیں اسی انداز پر اس سلسلہ کی ابتدا مسلم یونیورسٹی سے ہونی چاہیئے۔ ہم کو توقع ہے اگر اس اسکیم کو خلوص اور ہمت کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی تو اعلیٰ حضرت خسروِ دکن اور علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی فیاضی و بیدریغ بخششی کے ہم سزاوار ہوں گے۔

مشرقی شاعری میں شراب وساقی کو ہمارے شعرا نے

جو اہمیت دی ہے اور اس کا اثر عام طبائع پر جیسا کچھ ہوا ہے وہ بعض حیثیتوں سے دلچسپ بھی ہے اور عبرت ناک بھی کہا جاتا ہے کہ مشرقی شاعری صرف شراب و سرور اور اس کے غیر مستحسن اثرات کی ترجمان ہے اور عمر خیام کو یورپ میں جو قبولِ عام نصیب ہوا ہے، بعضوں نے اسے یورپ کی رندی و بادہ گساری پر محمول کیا ہے۔ لیکن حقیقتاً شاعر شراب و ساقی کے مادی مفہوم سے کہیں بلند ہوتا ہے وہ اپنے نغموں کے موزوں ہونے کے لئے ایک تحریک اور ایک قسم کی رہبری چاہتا ہے۔ اس کے جذبات متلاطم ہوتے ہیں، نغمے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن ساکت اور خفتہ، فضا بھی متعین ہو جاتی ہے۔ اب صرف ایک تخلیقی وجدان کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر شاعر نور و نغمہ سے مسحور ہونے اور مسحور کرنے لگتا ہے۔ اس ربانی ارتعاش یا رہبری کی ضرورت ہر زبان میں ہمیشہ تسلیم کی گئی ہے۔ انگریزی میں "پوئٹک میوز" کی وہی حیثیت و اہمیت ہے جو ہمارے یہاں شراب و ساقی کی ہے۔

چغتائی نے "ساقی" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ساقی مکروہات دنیوی سے بے پروا ہو کر شاعر کو

سیراب کر دینے کے لئے بینا سے شراب اونڈیلتا ہے دوسری جانب شاعر اپنے گوناگوں تخیلات کی پہنائیوں اور گہرائیوں میں غائب ہے اور رہبری کے لئے ایک 'اشارہ' کا متمنی ومتلاشی' ساقی نے شراب انڈیلی شاعر ساغر نہیں سامنے کرتا بلکہ شراب کو انگلیوں پر اچھالتا ہے. شراب کی دھار شاعر کی انگلیوں سے مس ہو کر قطروں میں منتشر ہو جاتی ہے اور یہی قطرے ہر طرف پھول بن بن کر گرتے ہیں یہ ہے شاعر کا "نغمہ محسوس" یا "وجدانِ حرمی"!

دوسری تصویر" ارض عافیت" ہے دنیا کے شور وفتن اور زندگی کی ہنگامہ زائیوں سے دُور سنسان اور ویران گوشہ میں ایک چھتری نما درخت کے تلے' ایک مزار ہے. یہ کتاب ہستی کی "تمت" ہے اور بحرِ حیات کا آخری افق' سلطان و گدا' ظالم ومظلوم' فاسق و متقی' عالم و جاہل اپنی اپنی تگ وتاز میں کتنا ہی آگے پیچھے کیوں نہ رہے ہوں' اس آخری منزل سے نہ آگے بڑھ سکے اور نہ پیچھے رہنے دیئے گئے. درخت انسان کی وسعت طلبی کا مظہر ہے لیکن جہاں چغتائی نے اپنے کمال اور اپنی "اوپٹمزم" (امید آفرینی) یا "اسلام" کا ثبوت دیا ہے وہ گلِ لالہ ہے جو مزار

کے پہلو میں نظر آتا ہے۔ یہ آمرز گار اعظم کی طرف سے ہر مایوسی" پسمزم" کے لئے پیام امید ہے اور مناجات ہستی کی' آمین۔

یہ تو چغتائی کی تخلیقی صناعت کا مفہوم ہے دوسری طرف ان کے کمالِ فن پر ایک ماہرِ فن نے جو حکم لگایا ہے وہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے۔

حال ہی میں تھیاسوفیکل سوسائٹی مدراس کی پچاس سالہ جوبلی کی نمایش تصاویر کے متعلق نیو انڈیا مدراس میں امریکہ کے مشہور ماہر فن تصاویر مسٹر منٹو کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں چغتائی کے کمال فن پر نظر ڈالی گئی ہے ہم اس کا جستہ جستہ اقتباس پیش کرتے ہیں۔

...... ایک اور دلچسپ موازنہ مسلمان مصور عبدالرحمٰن چغتائی اور بعض یورپین مصورین کے مابین ہو سکتا ہے، یہاں چغتائی کی ایک تصویر کے نقش و نگار اور مسٹر مکلاسک کی روغنی تصویر مد نظر ہیں یہ دونوں مرقعے فن کی خصوصیات اور خوبیوں کی ترجمان ہیں مگر دونوں پر نظر رکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے

گویا کسی کھرڑ ہارے کے کام کا ہاتھی دانت کے مبنت کار کے کام سے مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ چغتائی 'خط' کا بہترین استاد ہے۔ خطوط کی شوخی اور بانکپن نزاکت کی آخری حدود پر پہنچ کر نمایاں ہوئے ہیں۔ یہ تمثیلی نہیں بلکہ تخئیلی ہیں کیونکہ اس کا ہر پہلو' مادیت کی آلودگی سے منزہ ہے۔ اس کی دوسری تصاویر بجائے خود خوبی اور تکمیل کا نمونہ ہیں۔ انگریزی مصور برنٹ جونز کی مانند اس کی تصاویر پر ایک وجدانی حیرت بخش اور سکوت آگیں فضا طاری ہے۔ اس کی تصاویر کی طرف متوجہ ہوتے ہی اس کے سحرِ فن سے مسحور ہو جانا پڑتا ہے۔ غالباً اس کا شاہکار 'شاعر' ہے جس پر ایک خاص بزرگی اور علویت طاری ہے اور اسی اعتبار سے اس (تصویر) کو شرف اولیت حاصل ہے۔ بحیثیت ماہر فن کے چغتائی کو 'خط' اور 'رنگ' کے ضبط میں جو کمال حاصل ہے وہ ہمارے جذبۂ تحسین و تکریم کو اُبھارتا ہے تصاویر کے مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گو اس کے 'رنگ' کا دائرہ محدود ہے مگر اس کے اندر ہی کمال اور تکمیل کی آخری منزلیں طے ہو چکی ہیں۔ موجودہ انگریزی مصور مسٹر ہیڈن ولسن

(خاکہ نگار) جس سے میں واقف ہوں چغتائی کی بندش
خط، تک رسائی رکھتا ہے۔ لیکن رنگوں کے امتزاج میں
چغتائی کامل طور پر مشرقی معلوم ہوتا ہے میرے پاس
مسٹر فلیکس کی صناعت کے چند نمونے ہیں جو اس مشرقی
ہستی کے سامنے خام اور بھدے نظر آتے ہیں......"

اس کے بعد ناقد نے ٹگور اسکول کے نمونہ پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے لیکن ان میں کوئی ندرت یا کمال نہیں بتاتا اور آخر میں اپنے مقابلہ کو یوں ختم کیا ہے۔

"... ... ...کیا مشرقی تخیلات کے دخل نے ہمارے مطمح نظر کو بدل دیا ہے ......

یہاں آکر یا تو میں مشرقی ہو گیا ہوں یا پھر یہ چغتائی کی تصاویر کی سحر آفرینی ہے .. .. الخ"

ہمارے ناظرین یہ معلوم کر کے مسرور ہوں گے کہ چغتائی نے غالب اور خیام کو بھی مصور کرنے کا عزم کر لیا ہے خیام کی بعض رباعیات کو یوروپین مصورین نے تصویر کے جامہ میں پیش کیا ہے لیکن ان کو دیکھکر اکثر غالب کا پہلا شعر ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

یاد آجاتا ہے۔ ہم کو امید ہے خود غالب کو مصور کرنے میں چغتائی

کو زیادہ کامیابی ہو گی۔

عالی جناب نواب حمیداللہ خاں صاحب بہادر بالقابہ بی اے (علیگ) کو تخت بھوپال کا صحیح اور موزوں ترین جانشین قرار دے کر حکومت برطانیہ نے جس تدبر و تدین کا ثبوت دیا ہے وہ ہر طور پر قابل تحسین و امتنان ہے پرنس موصوف "علی گڑھ کے اولڈ بوائے ہیں" بیسویں صدی کا شاید ہی کوئی ایسا علیگ ہو گا جو پرنس موصوف سے واقف نہ ہو ہم کو یہ کہنے میں مطلق باک نہیں ہے کہ پرنس ممدوح کی ذات میں "علی گڑھ بوائے کا بہترین نمونہ ملتا ہے" باوجود اتنے بلند رتبہ کے جہاں اکثر پاؤں کی لغزش ہو جاتی ہے۔ پرنس کے اخلاق و مروت میں کسی قسم کا فرق یا تصنع نہیں پیدا ہوا وہ علیگ نواز نہیں علیگ پرست واقع ہوئے ہیں علی گڑھ کا کرکیٹ اگر کبھی نہیں بھلایا جا سکتا تو کرکیٹ پرنس کو فراموش نہیں کر سکتا، علمی خدمات کے سلسلہ میں غالب کا نسخہ حمیدیہ پرنس کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیگا' یہ ہماری برگزیدہ چانسلر علیا حضرت ہز ہائی نس فرماں روائے بھوپال کی فیاضی،

بزرگی، سیر چشمی، خدا ترسی، مسکین نوازی، علم دوستی اور عفو و کرم کا انعام ہے کہ خدائے برتر و توانا نے محترمہ کو ایسا صحیح جانشین عطا فرمایا، ہم اسے حکومتِ بھوپال، علی گڑھ اور تمام مسلمانانِ ہند کی خوش نصیبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم نہایت خلوص اور عقیدت کے ساتھ انجمن اردوے معلیٰ کی طرف سے علیا حضرت کی خدمت بابرکت میں تہنیت کا ہدیۂ محقر پیش کرتے ہیں اور پرنس ممدوح کی خدمت میں نسخہ حمیدیہ سے ایک شعر

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

سر سپرو نے لکھنؤ یونیورسٹی کی تقریب تقسیم اسناد پر اردو کے متعلق اور ہز ہائینس مہاراجہ صاحب بہادر الور نے جشن جوبلی کے موقع پر مدرسۃ العلوم کے بارہ میں جن خیالات کا اظہار فرمایا اس کے ہم بدل احسان مند اور شکر گزار ہیں، اردو کی توسیع اور ترقی کے لئے سر سپرو نے جن الفاظ میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی رہبری فرمائی وہ کئی اعتبار سے حامیانِ اردو بالخصوص ان ہندو بزرگوں کے لئے سبق آموز ہے جو ہندی اور اردو کو مسئلہ ہندو مسلم کی شکل میں پیش

کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہندی اُردو اور اس قبیل کی دوسری زبانیں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہم سب کی ہمدردی اور خلوص کی سزاوار ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہندی پرچار سبھا دونوں اس اعتبار سے کہ وہ ہندوستانی زبانوں کی ترقی میں کوشاں ہیں قابل تحسین و تشکر ہیں۔ ہز ہائنس کا خطبہ جن مخلصانہ جذبات کا ترجمان تھا اور اس کا عملی ثبوت ممدوح کا گراں قدر عطیہ جو ادارہ دینیات کی توسیع و ترقی کے لئے مخصوص کیا گیا تھا دونوں مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ایک نہایت اُمید افزا باب کا افتتاح کرتے ہیں اور ہم اس کو جشن جوبلی کا نہایت کامیاب پہلو تصور کرتے ہیں۔ آج کل ہندو مسلمانوں میں جیسی کچھ کشاکش ہے اور اس وجہ سے ہندوستان کا مستقبل جتنا تاریک نظر آتا ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے ہم کو توقع ہے مہاراجہ ممدوح کے مخلصانہ ارشادات اور عالمانہ نکتے ہندو مسلمان دونوں کو ایک بہتر اور خوشگوار تر نتیجہ پر پہنچنے میں معین ہوں گے۔ ہز ہائنس کی رواداری اور وسیع چشمی کا محرکِ اعظم یہی مقصدِ نیک تھا غالباً ہمارے ناظرین یہ سن کر متعجب اور مسرور ہوں گے کہ ہز ہائنس کو اُردو شاعری کا خاص ذوق ہے اگر ممکن ہو سکا تو

ہم کبھی مہاراجہ بہادر کے کلام سے ناظرین کو روشناس اور محظوظ کرا سکیں گے۔

غالباً یہ خبر نہایت مسرت و امتنان سے سُنی جائے گی کہ علیا حضرت ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال، ہماری محترمہ چانسلر نے تعلیم نسواں کے نصاب کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک گراں قدر رقم عطا فرمائی ہے اور عنقریب جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر اور شیخ عبد اللہ صاحب خازن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اس سلسلہ میں مناسب کارروائی عمل میں لانے والے ہیں۔ اس بارۂ خاص میں ہر دو بزرگوں سے ہماری استدعا ہے کہ اس کام کو جلد سے جلد لیکن نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ شروع فرمائیں۔ لڑکیوں کی تعلیم سے کسی متنفس کو انکار نہیں ہے لیکن تعلیم کی نوعیت کیا ہو، ہماری قوم و ملک کو اس وقت کس قسم کے طبقہ نسواں کی ضرورت ہے ہم ان کو کیا بنانا چاہتے ہیں اور ہم کو کیا کرنا ہے، ایک سلسلہ سوال ہے جس پر سکون و اعتدال کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

لڑکیوں کی تہذیب و تربیت کے لئے ہم کو مغرب کی طرف

متوجہ ہونا چاہیئے یا مشرق کی طرف؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم دونوں کو ہم آہنگ بنا کر اپنے لیئے ایک تیسرا نمونہ قائم کریں۔ ہم میں دو گروہ ہیں ایک کلیتہً مغرب کا دلدادہ ہے اور دوسرا کلیتہً مشرق کا پرستار۔ موخر الذکر کو ہم فی الحال نظر انداز کرتے ہیں لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے اب تک لڑکیوں کو مغربی طرز کی تعلیم دے کر وہ نتائج حاصل نہیں کیئے جا سکے ہیں جس کی ہم کو تمنا یا جس کی ہم کو بحیثیت اس کے کہ ہم مغربی نہیں ہیں۔ ضرورت ہے۔ اس خرابی کا سبب یہ ہے کہ ہم نے مغرب کا مطالعہ جس ہمدردی اور شوق سے کیا ہے اس ہمدردی اور شوق سے خود اپنے حالات اور روایات کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ایک مفلس محکوم اور درماندہ مشرقی قوم کی حیثیت سے ہماری مخصوص ضروریات اور پابندیاں ہیں ان کو کسی حالت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیئے ہماری لڑکیوں کی تعلیم ایسی ہونی چاہیئے جو ان ضروریات کی کفیل ہو۔ ہم کو اس وقت کسی نمونہ کی پیروی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ خود ایک نمونہ پیدا کرنا چاہیئے۔ اکثر اس کا سرسری جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہماری یہ حالتِ زار کمی تعلیم کے سبب سے ہے لیکن تعلیم کی کمی کے معنے مغرب کی تقلید کے تو نہیں ہو سکتے

اس کے بعد ہم کو یہ بتانا ہے کہ ہماری لڑکیوں کی تعلیم محض دماغی تفریح کی خاطر نہیں ہونی چاہیئے ہم کو اس وقت اسکی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ادبیات عالیہ یا فنون لطیفہ میں یگانہ روزگار بنیں یا کونسلوں اور کارخانوں میں ممبری یا انجینیری کی جگہ پر کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں، ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ حفظان صحت، سینا پرونا، پکانا، خانہ داری، بچوں کی نگرانی، دینداری سے بھی تعلق رکھتی ہیں یا نہیں اس کے ساتھ ساتھ ہم کو اس کا بھی انتظام کرنا چاہیئے کہ وہ ورزشی تفریح کے طور پر اپنے مکان کے احاطہ میں ترکاری اور پھل پھول بھی اگا سکیں اس کے علاوہ بچوں کی چھوٹی موٹی بیماری کی دوا بھی کر لیا کریں۔ ان تمام ضروری فرائض کو ادا کرنے کے بعد اگر موقع مل سکے تو پھر بعض مغربی سنتیں اور نوافل بھی ادا کر لیا کریں، ہاں ان کی "قضائے عمری" البتہ ایسی چیز ہے جس سے بچنا "واجبات" سے ہے

ہم کو یاد رکھنا چاہیئے ہر قوم کی ترقی کے منازل ہوا کرتے ہیں۔ مغرب کی بہت سی باتیں جن سے ہم اپنی بہنوں اور بچیوں کو آشنا کرانا چاہتے ہیں وہ مغرب کی موجودہ ترقی یافتہ قومی زندگی کے "تعیشات" ہیں۔ ہم کو ابھی "ضروریات" بھی

میسر نہیں ہیں۔ غبار آلود چہرہ پر غازہ پاشی کا نتیجہ!!

ہم کو امید ہے کہ ہمارے دونوں بزرگانِ محترم ایک نمایندہ مجلس نصاب مقرر فرمائیں گے جہاں ان امور پر سکوت و اعتدال کے ساتھ غور کیا جا سکے۔

جوبلی کے موقعہ پر جو اُردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کی صدارت ہمارے محترم و مشہور ادیب و عالم مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نواب صدر یار جنگ بہادر نے فرمائی تھی خطبۂ صدارت تقریری تھا ہمارے بزرگ مکرم مولانا محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی مینجر انسٹی ٹیوٹ پریس نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ حتی الوسع تقریر کا ایک نہایت جامع خلاصہ سہیل میں شائع ہونے کے لئے عنایت فرمائیں گے۔

ہر دو بزرگانِ محترم حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ ہم کو انتہائی رنج و شرمساری ہے کہ وہ تقریر اس بار سہیل میں شائع نہ ہوسکی اس کا سبب مینجر صاحب کی غیر معمولی مصروفیت تھی۔ ہم کو توقع ہے وہ بخیر و عافیت زیارت بیت اللہ سے تشریف لاکر اس فریضہ سے سبکدوش ہونے کی

کوشش فرمائیں گے اور اس دوران میں نواب صدر یار جنگ بہادر سے ہماری طرف سے معذرت فرماتے رہیں گے۔ ہم کو یقین ہے نواب صدر یار جنگ بہادر یوں بھی بہت کم آزردہ ہوا کرتے ہیں اور آزردہ ہونے پر بھی درگزر فرمانے پر آمادہ رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے مینجر صاحب کا توسل، ہماری کمزوریاں، نواب صاحب کا خلق حلم اور ارض حرم کی فضا کچھ ایسے واقعات ہیں کہ ہم باوجود کوشش کے بھی مایوس یا ہراساں ہونے پر قادر نہیں ہیں۔

نواب صدر یار جنگ بہادر کے خطبہ کی جان ممدوح کا "دل نشیں اندازِ بیان" تھا۔ دل نشین انداز بیان بعض "پیشہ ور" مقررین کا بھی ہوتا ہے لیکن یہاں ایک نہایت لطیف اور بغایت مہتم بالشان امتیاز ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ جسے ہر شخص محسوس کرتا ہے لیکن اس کا سبب دریافت کرنے سے معذور رہتا ہے۔ فاضل مقرر نے اردو کے ادبی پہلو کو شروع سے آخر تک مدِ نظر رکھا۔ فرمایا:-

"زبانوں ہی کا نہیں اقوام و ملل کا بھی عروج و تنزل ذوق ادب سے وابستہ ہے۔ مختلف اقوام مختلف معاشرتی

مسائل بر دست و گریبان ہوتی رہتی ہیں، اس زد میں بڑی بڑی سلطنتیں ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی ہیں، لیکن ادب کا صحیح ذوق مسلسل شیرازہ بندی کرتا رہتا ہے ہندو مسلمان آج ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ہیں لیکن اُردو کے شیدائی ان اختلافات سے بہت بلند سطح پر ہیں۔ کم نظر طبائع اُردو کو اختلاف کا باعث قرار دیتے ہیں۔ لیکن جن کو ادب کا صحیح ذوق ہے وہ اس کو سینوں سے لگائے ہوئے ہیں، اور اسی کو وسیلہ ارتباط تصور کرتے ہیں ذوق ادب ہر قوم میں فطری ہوتا ہے اور جب تک یہ قائم رہتا ہے قوم بھی زندہ رہتی ہے، ادب ہر قوم کی ظاہری و باطنی ترقیوں کا عطر ہوتا ہے۔ جب سے انسان نے متمدن حیثیت اختیار کی کتنے اور کیسے کیسے انقلابات ہوئے لیکن ان کے ادبی جواہر ریزے اب بھی آنکھوں سے لگائے جاتے ہیں اور ان کے نام لیوا باقی ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ ہم سے یہ خصوصیات فنا ہورہی ہیں جس چیز کو ہمارے خمیر میں ملا ہونا چاہیئے تھا اس کو حاصل کرنے کے لئے یا اس سے روشناس ہونے کیلئے ہم یورپ جاتے ہیں اور وہاں کے سارٹیفکٹ کو اپنے

ذوق ادب کا ثبوت قرار دیتے ہیں، شاید وہ دن دور
نہیں ہے کہ کلام پاک سمجھنے کے لئے بھی ہم یورپ جایا کریں،،

تقریر کا سلسلہ کامل پونے دو گھنٹے قائم رہا اور اس دوران میں مجمع ہمہ تن گوش بنا رہا۔ ممدوح نے اس مسئلہ پر اس سادگی لیکن موثر طریقے سے تقریر فرمائی گویا جو کچھ ارشاد ہو رہا ہے وہ بجائے کسی مقرر کے زبان سے ادا ہونے کے خود بخود فضا میں پیدا ہو رہا ہے، گویا یہ وہ باتیں تھیں جو عین فطرت ہونے کے باعث کسی مصنوعی طریقۂ اظہار کی رہین منت نہ تھیں۔

اتنے واضح اشارات کے بعد یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ یہ سب کچھ محض اس سبب سے تھا کہ مقرر خود اس کا مکمل نمونہ تھا!

ہمارے بعض کرم فرما سہیل کی مختصر روداد حیات سننے کے بھی منتظر ہوں گے، ہم نہایت مسرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ سہیل کی پذیرائی ہماری توقعات سے کہیں زیادہ ہوئی، ہندوستان کے ہر گوشہ سے ہمارے کرم فرماؤں نے ہماری ناچیز مساعی کی داد دی، لیکن سب نے ایک زبان ہو کر

یہی اندیشہ ظاہر کیا کہ سہیل جس آب و تاب سے نکلا ہے شاید یہی اس کے خاتمہ کا باعث ہو۔ ہم اس اندیشہ سے بے خبر نہیں ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ سہیل کے کرم فرماؤں کے دل میں سہیل کی محبت پیدا کردے۔ بذاتہ تائید غیبی کی تعبیر ہم اسی طور پر کرتے آئے ہیں۔

اسی سلسلہ میں بے موقع نہ ہوگا اگر ہم اپنے قلمی معاونین کو بھی تھوڑی دیر کے لئے مخاطب کرلیں۔ سہیل میں شائع ہونے کے لئے جو مضامین نظم و نثر بھیجے جاتے ہیں ہم کو اس کا اعتراف ہے کہ وہ نہایت محنت اور جگر کاوی سے لکھے جاتے ہیں، ہم کو اس کا بھی اقرار ہے کہ مضمون نگار کو اس سلسلہ میں نام و نمود کی بھی تمنا نہیں ہوتی۔ ہم کو یہ بھی تسلیم ہے کہ بعض مضامین محض مرتب کو زیر بار منت کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ بایں ہمہ اس کا صدمہ بھی ہے کہ یہ شائع نہیں کئے جاتے، کس اصول پر؟ اسی اصول پر جس کے رو سے بعض صاحبان اپنے عنایت نامہ میں سہیل کی اجرا پر مرتب کو دعائیں اور مبارکباد دیتے ہیں، سہیل کی ظاہری اور باطنی خوبیوں پر سر دھنتے ہیں اردو کے مستقبل کو صرف سہیل کی ذات سے وابستہ سمجھتے ہیں، وی پی طلب

کرتے ہیں بار بار یاد دہانی کراتے ہیں اور ـــــــ واپس کر دیتے ہیں ! !

سہیل میں بہت سے مضامین شائع ہونے کے لئے آئے لیکن کسی نہ کسی بنا پر شائع نہ کئے جا سکے ان میں ۷۵ فی صدی مضامین صنفِ نازک کے تھے۔ ہم کو رنج و شرمندگی ہے کہ ہم ان کی محنت یا شوق سے بہرہ مند نہ ہو سکے۔ یہ مضامین سہیل میں شائع نہیں کئے جا سکے اس کا سبب یہ نہ تھا کہ مضامین بجائے خود اچھے نہ تھے بلکہ یہ ہمارے مقاصد کے ہم آہنگ نہ تھے۔ فرقۂ نسوان ہی نہیں بلکہ دوسرے حضرات سے بھی ہم استدعا کریں گے کہ وہ سہیل کے معیار کا کچھ دنوں تک مطالعہ فرمائیں اور اس کے بعد انصاف و رحم کے ساتھ غور فرمائیں کہ ہم ان کی رشحاتِ قلم کے "مستوجب" سزاوار ہیں یا نہیں۔ ہم کو اس سے مایوسی ہوئی کہ صنفِ نازک نے نثر کے بجائے نظم کو اپنے خیالات کا حامل بنا کر سہیل کے اوراق کا مطالعہ کیا ہے۔ بعض مضامین نثر کے بھی موصول ہوئے لیکن وہ نظم کے حدود سے بھی تجاوز کر گئے تھے۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے ہم ضرورت سے زیادہ محتاط ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ اس بارہ خاص میں ہمارے عنایت فرما ہم کو زیادہ

مجبور نہ فرمائیں گے۔ ہم یقین دلاتے ہیں بشیتر مضامین ہمارے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو ہمارے بزرگ مولانا محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی مینیجر سہیل کا سہ ماہی بل کرتا ہے یعنی ———— قلب کی حرکت متغیر ہونے لگتی ہے!

اگر بعض مضامین شائع نہ ہوں تو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مضمون نگار حضرات کم عزیز ہیں بلکہ اس کا سبب محض یہ ہوگا کہ سہیل زیادہ عزیز ہے۔

جہاں تک ہم کو علم ہے اس وقت ہندوستان میں اردو کے صرف دو ایسے رسالے ہیں جو سہ ماہی شائع ہوتے ہیں۔ ایک اُردو اور دوسرا سہیل۔ اُردو کی سالانہ قیمت ہئے سالانہ اور سہیل کی لے باطنی خوبیوں کے متعلق ہم کو کچھ نہیں کہنا ہے۔ صرف ظاہری حیثیت کے اعتبار سے یہ عرض کرنا ہے کہ سہیل میں تصاویر کا بھی انتظام ہے بہترین کاغذ پر شائع ہوتا ہے اور ہندوستان کے بہترین لیتھو پریس میں چھپتا ہے۔ اس لئے جہاں تک ظاہری شکل وصورت کا تعلق ہے سہیل کے مصارف یقیناً اُردو سے گراں ہیں۔ اس کے بعد ڈاک کا سوال آتا ہے، ہم اس معاملہ

میں اُردو کے پیرو ہیں یعنی اپنے خریداروں کے پاس رجسٹری شدہ پیکٹ بھیجتے ہیں۔ اس طور پر ہر نسخہ پر ۶؍ مزید صرف کرنے پڑتے ہیں اور اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔

اس لئے آج تک جتنے حضرات مستقل خریدار ہو چکے ہیں ان سے ہم صرف ؁ سالانہ وصول کریں گے ــــــــــــــــ تاحیات فریقین

دوسرے بزرگوں سے ؏ سالانہ ــــــــــــــ تا اطلاع ثانی

نمونہ کا پرچہ علاوہ محصول ڈاک ؏ ــــــــــــ حسب معمول

ہم کو امید ہے ہمارے کرم فرما اپنی مجبوریوں کا تذکرہ کرنے سے پہلے ہماری حالت پر بھی رحم فرمانے کی کوشش، فرمالیا کریں گے۔

عذرِ گناہ موجودہ نمبر کسی قدر غیر معمولی تاخیر کے ساتھ شائع ہوتا ہے جس کے سبب سے ہم اپنے کرم فرماؤں سے شرمسار ہیں، اس کے اسباب بھی غیر معمولی تھے۔

پلیگ کے دار و گیر سے ایک ماہ کے لئے کالج بند کر دیا گیا۔ خاکسار مرتب بھی اخلاقاً مرعوب ہوا، اور علی گڑھ چھوڑنے پر مجبور۔ اس سے قبل بھی ایک عرصہ تک علی گڑھ

سے باہر رہا۔ یہ اسباب خود کیا کم تکلیف دہ تھے کہ مینجر صاحب عازم حج ہوئے!

اس "ائتلاف ثلاثہ" پر صرف تین فقرے ذہن میں آئے۔ ناظرین کرام جس کو جہاں موزوں سمجھیں چسپاں کریں۔

۱۔ انا للہ .. .. .. الخ

۲۔ خوے بدرا .. .. الخ

۳۔ لبفر رفتنت .. .. الخ

(نوٹ) براہ کرم ان کی ترتیب میں عجلت یا غفلت سے کام نہ لیں۔

۳

صوبہ کی مجلس واضعانِ قانون میں ۷ اپریل ۱۹۲۶ء کو حافظ ہدایت حسین صاحب ام ال سی، بیرسٹر ایٹ لا کانپور نے ہندوستانی اکیڈیمی کے قیام اور اس کے اغراض ومقاصد کے متعلق جو مبسوط اور مدلل تقریر فرمائی تھی اس کے جستہ جستہ اقتباسات ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں:-

۱- مجوزہ اکیڈیمی کا مقصد یہ ہوگا کہ جو لوگ مختلف علوم مثلاً طبیعات، اجتماعیات، ادبیات و فنون لطیفہ وغیرہ پر طبعزاد تصانیف پیش کریں انعام و معاوضہ سے ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ جیسا کہ صوبہ پنجاب میں اس قسم کی ایک تحریک گورنمنٹ منظور کر چکی ہے۔

۲- ترجمہ کے ذریعہ سے دوسری زبانوں کی مفید اور قابل قدر

تصانیف اردو اور ہندی میں منتقل کی جائیں اس کے لئے
ایک دارالترجمہ کے قیام کی ضرورت ہے۔

۳۔ مجوزہ اکیڈیمی قدیم اردو ہندی کتب کی تالیف و تدوین کا بندوبست کرے گی۔ یہ تصانیف جن میں علم و کمال کے خزانے مدفون ہیں اس کی مقتضی ہیں کہ ان سے موجودہ دور اور نسل کو آشنا کرایا جائے، بصورت دیگر ان نادر اور قیمتی کتابوں کے تلف ہو جانے کا احتمال ہے اور یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہو گا۔

۴۔ اس اکیڈیمی کا مقصد لغات، انسائیکلوپیڈیا اور دیگر علوم و فنون کی مخصوص لغات اور شرحیں تیار و مرتب کرنا ہو گا۔

۵۔ اس اکیڈیمی سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ملک کے لئے ایک مشترک زبان کے مسئلہ کو بھی طے و متعین کر سکے گی جس کی ضرورت اس وقت سختی کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔

۶۔ اس اکیڈیمی کے قیام سے یہ بھی پیش نظر ہے کہ وہ ان صاحبان تصنیف کو جو اس کے مستحق ہوں گے پنشن اور وظائف بھی دے سکے گی۔

اس سلسلہ میں فاضل ممبر کونسل نے اکیڈیمی کا ایک سرسری خاکہ

بھی پیش کیا تھا:

"اس اکیڈمی کا انتظام در و لبست ایک جنرل کونسل کے تحت میں ہونا چاہیے جس کے سرپرست ہز اکسیلنسی گورنر ہوں اور وزیر تعلیمات اس کے صدر اور اس کے ارکین ڈائرکٹر تعلیمات اور صوبہ کی ہر چہار یونیورسٹی کے اردو ہندی کے ایک ایک نمائندہ ہوں۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ امتحانات کے بورڈ کا سکرٹری اور ۶۰ دوسرے اراکین جن کی نامزدگی وزیر تعلیمات کے مشورہ سے ہز اکسیلنسی فرمائیں گے یا جیسا کہ بعد میں طے ہو ان کا انتخاب دوسری علمی جماعتیں کریں گی۔ وزیر تعلیمات اس کا خازن منتخب فرمائیں گے ایک جماعت عاملہ ہوگی جس کا فرض سرمایہ کی فراہمی اور اس کا انتظام ہوگا۔ یہ جماعت کونسل کے عام معاملات مثلاً انعامات کے لئے روپئے کی منظوری کتابوں کی فروخت و اشاعت وغیرہ کے متعلق مناسب تدابیر عمل میں لائے گی۔ جماعت عاملہ ان اراکین پر مشتمل ہوگی جن کا تقرر جناب صدر اور اکیڈمی کی جماعت عام کرے گی۔ اس جماعت میں فرض کیجئے ۱۵ ممبر ہوں گے جس میں ایک چرمین ہوگا اور ان اراکین کے علاوہ جن کا انتخاب

جنرل کونسل کرے گی اس میں وزیر تعلیمات کے نامزد کردہ اراکین شامل ہوں گے اس کے بعد ایک جماعت تعلیمی ہوگی جو ترجمہ کے علاوہ طبعزاد تصانیف کے لئے مضامین کا انتخاب کرے گی۔ یہی جماعت جج مقرر کرے گی۔ اس کے علاوہ دوسری سب کمیٹیاں ہوں گی جو اکیڈیمی کے سرکاری مقاصد کے اتمام و تکمیل کی نگراں رہیں گی وغیرہ"

اس کے جواب میں آنریبل وزیر تعلیمات نے تقریر فرمائی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"اس قسم کی ایک تحریک پنڈت بجن نراین ادپادھیا صاحب نے دسمبر کے اجلاس میں پیش کی تھی مجھے اس تحریک سے پوری ہمدردی ہے اور میں اردو اور ہندی دونوں کا پرستار ہوں۔ پچیس ہزار روپیہ کی بجٹ میں گنجائش رکھی گئی ہے اور گو اکیڈیمی کے مقاصد کے مقابلہ یہ رقم حقیر ہے تاہم ابتدا کرنے کے لئے یہ بھی غنیمت ہے۔ فاضل محرک نے جو مقاصد بیان کئے ہیں وہ ہماری اولین توجہ کے مستحق ہوں گے۔ ہم کو امید ہے کہ ہم بہت جلد کام شروع کر دینے کے لئے ایک اسکیم پیش کر سکیں گے"[۱]

[۱] کونسل سے ۲۵ ہزار کی منظوری ہو چکی ہے اور اکتوبر میں اکیڈیمی کی اسکیم کے بر روئے کار آنے کی توقع ہے (مرتب)

اس تقریر کے بعد حافظ ہدایت حسین صاحب نے آنریبل وزیر تعلیمات کے جواب کو "نہایت اُطمینان بخش" قرار دیتے ہوئے کونسل کی اجازت سے اپنی تحریک واپس لے لی۔

اس تحریک میں آیندہ کیا ہونا چاہیئے۔ اس کے متعلق ہم سہیل کے پچھلے نمبر میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کر چکے ہیں۔ ملک کے تقریباً تمام علم دوست حضرات اس اکیڈمی کے قیام کے متمنی ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ حکومت جلد سے جلد اس بات میں کوئی تشفی بخش اسکیم شایع کرے گی لیکن قبل اس کے کہ حکومت اس مسئلہ میں کوئی قطعی اسکیم پیش کرے ہم آنریبل وزیر تعلیمات سے درخواست کریں گے کہ وہ اسکیم مرتب کرنے سے پہلے سربرآوردہ اُردو اور ہندی ماہرین کا ایک جلسہ (خواہ اس کی حیثیت بالکل پرائیویٹ ہو) منعقد فرمائیں تاکہ دونوں زبانوں کی مخصوص ضروریات ان کے پیش نظر رہیں اور اس طور پر اسکیم کی ترتیب میں ہر قسم کی سہولت ہو اور آیندہ یک قلم ترمیم یا تنسیخ کی (خدانخواستہ) نوبت نہ آئے۔

آخر میں ہم پنڈت برجن نراین ادیا دھیا حافظ ہدایت حسین صاحب اور اڈیٹر صاحب زمانہ کے شکر گزار ہیں جن کی مستقل کوششوں

اور آنریبل وزیر تعلیمات کی ہمدردی اور علم دوستی سے ہندوستانی اکیڈیمی کی تجویز اس منزل تک پہنچی سر سپرو اس اکیڈیمی کے صدر تجویز ہوئے ہیں ؎

سالے کہ نکوست از بہارش پیدا ست

لاہور میں بعض علم دوست اور سرگرم اصحاب نے ایک اردو اکاڈمی (اردو مرکز) کی طرح ڈالی ہے جس کا نظام عمل حسب ذیل ہے۔

(۱) اُردو کے اس حصہ ادب و شاعری کو (جو محفوظ رکھنے کے قابل ہے اور جو دراصل اس کی آیندہ ترقی کا اصلی ہیولیٰ ہے) جلد سے جلد انتخاب کے بعد مستقل مجلدات کی صورت میں ترتیب دینا۔

(۲) اُردو زبان اور اصطلاحات علمیہ کی ایک مبسوط لغت کی ترتیب

(۳) اُردو میں ایک مخزن العلوم (انسائیکلو پیڈیا) تحریر کرنا۔

(۴) اُردو زبان کی فتوحات ادبیہ کا ایک منتخب مجموعہ سال بسال مجلدات کی شکل میں پیش کرتے رہنا۔

(۵) گراں قدر نایاب مطبوعہ اردو کتابوں کی ترتیب، تہذیب اور حسب استطاعت ہر قسم کی علمی ادبی اردو تصانیف کی اشاعت۔

(۶) "اُردو مرکز" کی مجلس مشاورۃ (جو درحقیقت اُردو
زبان کے لئے ایک ادبی دارالافتا ہے) کے
ذریعہ سے علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی
اختراع اور متنازعہ فیہ امور ادب کے متعلق ناطق فیصلہ۔

اراکین کے سلسلہ میں مولانا تاجور نجیب آبادی، جناب اصغر گونڈوی، جناب اختر شیرانی اور جناب جگر مراد آبادی وغیرہ صاحبان کے نام نامی نظر آتے ہیں۔ سنت صحافت تو یہ تھی کہ ہم اس لائحہ عمل کے حسن و قبح پر ایک طول طویل مقالہ (جو بعد میں سب و شتم میں تبدیل ہو جاتا) درج رسالہ کرتے لیکن معلوم ہوا ہے کہ بسلسلہ "قضیہ زمین بر سر زمین" خود لاہور میں اس کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس لئے یہ فرض خود بخود آسان ہو گیا۔ بہر حال کام نہ کرنے یا کام نہ ہونے دینے کی یہی ترکیب ہمیشہ موثر رہی ہے۔ لیکن ہم اراکین "اُردو مرکز" کو مشورہ دیں گے اور کسی محفوظ مقام سے مشورہ دینا دُنیا میں سب سے آسان و پُرلطف مشغلہ ہے کہ وہ مخالفت سے مایوس یا مشتعل نہ ہوں۔ یہ جذبات ان لوگوں میں پیدا ہوتے ہیں جن کو اپنے مقصد یا اپنی قوت عمل پر اعتماد نہیں ہوتا بے جا مخالفت خود مخالفین کے لئے ایک غیبی سرزنش ہے۔ تقدیر الٰہی یوں ہی چلی آتی ہے۔ اس لئے اس بارہ میں کچھ کہنا

سننا تحصیل حاصل ہے۔ ہاں ہم اتنا ضرور عرض کریں گے اور ہم کو اُمید ہے ارباب اُردو مرکز اس پر ہمدردی کے ساتھ غور فرمائیں گے کہ جو مقاصد اس وقت انجمن کے سامنے ہیں وہ بغایت بلند اور اتنے ہی دشوار ہیں۔ کافی رقم' کافی مدت' اور اچھے کام کرنے والوں کی ضرورت ناگزیر ہے۔ ہم کو اندیشہ ہے یہ سب باتیں انجمن کو میسر نہ ہوں گی۔ اس میں شک نہیں بہت کم ایسی جماعتیں یا مجالس ہوں گی جن میں یہ تمام باتیں موجود ہوں۔ لیکن یہ اس طور پر ممکن ہے کہ جو کچھ بھلا یا بُرا سامان اس وقت موجود ہے اس کو دیانت' کفایت' استقلال اور ہوشیاری کے ساتھ کام میں لائیں اور مدت تک اس کام کو چلاتے رہیں۔ انجمن کے دعاوے نہایت بلند آہنگ' نازک اور شاید خطرناک بھی ہیں اس لئے آہستہ روی' مستقل مزاجی اور بردباری کی اشد ضرورت ہے۔ ایک قابل جنرل اپنی حربی نقل و حرکت یا مقصد کا اعلان آلہ ناشر الصوت سے نہیں کرتا۔ انجمن نے جنگ سے پہلے اعلان فتح کیا ہے اس کو نباہنے کی ضرورت ہے۔

ہم کو مرکز کے اراکین' ہوا خواہوں اور اس کے مقاصد سے دلی ہمدردی اور عقیدت ہے' ہم اس کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہیں اور اس کے مخالفین سے آمین "بالجہر" نہیں تو "بالسّر"

کہنے کے ملتجی ہیں۔

ہم عصر زمانہ سے روایت ہے" پنجاب ڈرامیٹک کلب لاہور نے ہندوستانی تاریخ کے متعلق بہترین ڈراما لکھنے والے کو ایک ہزار روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس ڈرامے کو مذہب وسیاست سے سروکار نہ ہونا چاہیئے۔ پانچ ایکٹ سے زیادہ نہ ہوں اور زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں اسٹیج پر ختم ہوسکے۔

اس کلب کے روح رواں ہمارا خیال ہے کہ مسٹر تاج ہیں اور یہ کلب بجائے خود نوجوان لاہور کے بعض مشہور تعلیم یافتہ اور فنون لطیفہ کے باکمالوں کے عملی جد و جہد کا ایک نادر و دل پذیر نمونہ ہے۔ تاج، بخاری، حفیظ، مالک، حکیم، چغتائی غالباً اس بزم کے چشم و چراغ ہیں۔ انجمن ارباب علم (مرکز اردو) اس کلب کی حریف تصور کی جاتی ہے چشمک کا فطری سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دنیا کو" جوانی کی راتیں مرادوں کے دن" تصور کرتا ہے اور دوسرے کے ہاں چالیس سال سے کم عمر والے بخشے نہیں جاتے"۔ یاران سرپل" (ہمارے بعض نامعلوم نامہ نگار) نے صرف" تاج" اور" تاجور" سے اس کی تعبیر کی ہے۔

ہم اس حیثیت سے کہ دونوں کی حیثیات خصوصی سے محروم

یا مضمون، ہیں صرف اتنے پر اکتفا کریں گے ؎

شوخی بھی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

متذکرہ صدر ہم عصر سے یہ خبر معلوم کرکے نہایت مسرت ہوئی کہ ہمارے مشہور اُردو ادیب لالہ سری رام صاحب ام اے رئیس دہلی نے اپنی مشہور تالیف خمخانہ جاوید کی چوتھی جلد بھی مکمل کرکے شائع کر دی ہے "جس میں سین وشین سے شروع ہونے والے نام کے اُردو شعرا کے حالات مع نمونہ کلام درج ہیں"

خمخانہ جاوید اور دیگر علمی خدمات کے سلسلہ میں لالہ صاحب موصوف کا نام اُردو حلقۂ ادب میں ہمیشہ تحسین و تشکر کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ موصوف نے اپنے اس علمی شغف میں نہایت ایثار و قربانی سے کام لیا ہے۔ ہم کو امید ہے ممدوح کو اس قسم کی علمی خدمات کے بہترین مواقع ملیں گے اور ملک و قوم کو ان کی قابلیت و علم دوستی سے بیش از بیش فائدہ پہنچے گا۔ ہمارا ہدیہ تشکر۔

ہماری مسلم یونیورسٹی کے (و نیز دیگر) طلبا جو تکمیل تعلیم کے لئے ہر سال کثیر تعداد میں یورپ جاتے ہیں ان کو اکثر و بیشتر

انگریزی کے علاوہ دوسری یورپین زبانیں بھی سیکھنی پڑتی ہیں اس کمی کو پورا کرنے میں کافی وقت، محنت اور روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ بالعموم یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلباء یورپ کا عزم کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت کس قدر مایوس کن ہے کہ جہاں ہماری یونیورسٹیوں میں انگریزی اور السنہ مشرقی کے علاوہ دوسرے مضامین مثلاً فلسفہ، اقتصادیات تاریخ، سیاسیات و بعض دیگر فنون کے حاصل کرنے کا کافی سامان ہوتا ہے وہاں ایک تھوڑی توجہ کے ساتھ یورپ کی بعض مشہور زبانوں کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست نہیں ہے۔ اور دوسری زبانیں نہیں تو کم سے کم جرمن اور فرنچ کی تعلیم کا انتظام تو نہایت ضروری ہے۔

اس مسئلہ میں ہم مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ بعض مستند اور مقتدر اہل فکر کی رائے ہے کہ اس وقت علم و فن کے بعض بہترین ذخیرے المانی اور فرانسیسی زبانوں میں موجود ہیں اور جب تک ان زبانوں میں درک نہ ہو صرف انگریزی سے مکمل طور پر کاربرآری نہیں ہو سکتی۔ سر اقبال کا خیال ہے کہ اگر کچھ اور نہیں تو علوم اسلامیہ میں تبحر اور موجودہ یورپ کے فکر و آرا اور ان کی تفتیش و تحقیقات سے آشنا ہونے کے لئے فرانسیسی اور المانی

زبانوں پر قادر ہونا ایک گو نہ لازمی ہے۔ اس کے علاوہ جدید اسلام اور جدید ترکی سے آشنا ہونے کے لئے بھی لازم ہے کہ ہم ترکی زبان سے بھی استفادہ کریں۔ جمہوریہ ترکیہ نے اسلام، اسلامی حکومت اور اسلامی قوانین کو ایک جدید سطح پر لا کھڑا کیا ہے یا اس کی کوشش کر رہی ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ اس کا یہ فعل مستحسن ہے یا غیر مستحسن۔ ہم کو اس وقت انھیں کی سطح پر ان سے ملنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے ایک حد تک جس بنا پر ہم فارسی اور عربی یا کسی دوسری زبان کا سیکھنا ضروری سمجھتے ہیں اسی طور پر ترکی سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ علم وفن کے مختلف شئون اور شعبے ہوتے ہیں جن سے آشنا ہونا ہر طالب علم کا ایک دلچسپ اور مفید مشغلہ ہونا چاہیئے ترکی نے عربی فارسی سے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اس لئے ہمارا یہ خوش گوار فرض ہونا چاہیئے کہ ہم ترکوں کے سرمایہ ذہنی کا بھی مطالعہ کریں۔ سیاسی و اجتماعی حیثیت سے وہ ہم سے مختلف سطح پر ہیں۔ ان کے علم وادب بالخصوص ان کے موجودہ افکار و طریقہ کار سے ہمارا باخبر رہنا ہم دونوں کیلئے ضروری بھی ہے اور مفید بھی اور کچھ نہیں اگر محض علمی وادبی ہی حیثیت پیش نظر رکھی جائے تو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ

ہماری وہ تمام کوششیں جو ترکی حاصل کرنے کے لئے کی جائیں گی ہر صورت میں سودمند ثابت ہوں گی۔

اب رہا یہ کہ اس کا انتظام کیوں کر کیا جائے؟ سب سے پہلے پڑھانے والوں اور مالی دقتوں پر نظر پڑتی ہے یہ دونوں دقتیں ہمارے لئے بے حقیقت ہیں۔ پڑھانے والے خود ہمارے پروفیسروں میں موجود ہیں رہا روپئے کا سوال اس کا حل یہ ہے کہ اس کے لئے فی الحال کسی جدید ادارہ کے قیام کی ضرورت نہیں ہے۔ المانی اور فرانسیسی کو "ادارہ انگریزی" کی ایک شاخ بنادی جائے اور اسی طور پر ترکی کو فارسی یا عربی کی ایک شاخ قرار دیدی جائے ان زبانوں کا نصاب اور اوقات تعلیم کی ترتیب وغیرہ ادارہ جات متعلقہ کے سپرد ہو۔ لیکن اگر یہ بھی ناممکن ہو تو ان زبانوں کے اختیاری گروپ بنادیئے جائیں۔ جس طور پر ایک طالب علم انگریزی کے ساتھ اقتصادیات، فلسفہ تاریخ یا عربی، فارسی لے سکتا ہے اسی طریقہ پر اور اسی اصول کے ماتحت اگر وہ چاہے تو فرانسیسی، المانی یا ترکی لے سکے۔

ناظرین کرام غالباً یہ معلوم کرکے مسرور ہوں گے کہ ہمارے فاضل وائس چانسلر جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بالقابہ نے ہماری اس اسکیم سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور عنقریب ممدوح

اصحاب متعلقہ سے اس معاملہ میں گفت و شنید کرکے ایک قطعی فیصلہ صادر فرمانے والے ہیں۔

بے موقع نہ ہوگا اگر ہم یہاں ایک اور تجویز کا تذکرہ کریں جو اپنی وقعت اور اہمیت کے اعتبار سے ہماری اولین توجہ کی مستحق ہے۔ آج یہ ضرورت عام طور پر محسوس کی جارہی ہے کہ ہم کو صرف علم و ادب میں کاملین فن پیدا کرنے کے بجائے اپنے طلبا کو ایسے فنون اور طریقۂ کار سے بھی آشنا کرانا چاہیئے جن سے وہ آزادی اور فراغت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکیں۔ اب تک یونیورسٹی ڈگریاں یا تو نوکری کے خیال سے حاصل کی جاتی تھیں یا وکالت کے لئے' لیکن ان شعبہ جات میں اب "سمائی" نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ڈگری کے ساتھ اپنے طلبا کے لئے ایسے ساز و سامان و مواقعے بھی فراہم کریں جو ملازمت اور وکالت کے علاوہ بھی با فراغت اور مفید زندگی بسر کرنے میں معین ہوں۔ یہ ضرورت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی بالآخر جوبلی کے موقعہ پر ارباب یونیورسٹی نے ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا اعلان کیا۔ اس شعبہ میں طلبا کو صنعت و حرفت دستکاری یا برقی انجنیری وغیرہ کی تعلیم دی جائے گی۔ لیکن اس سے

کہیں زیادہ ضروری وہ فن ہے جس پہ ہندوستان کی آیندہ نجات و عظمت کا مدار ہے اور جسے ہندوستان اور ہندوستانیوں کا "پیدائشی حق" قرار دینا اظہار واقعہ ہے یعنی زراعت و کاشتکاری اس شعبہ میں فلاح و ترقی کے بے پایاں امکانات ہیں جس پر بحث کرنے کا نہ یہ موقعہ ہے اور نہ اس کی یہاں ضرورت ہے، علی گڑھ میں گورنمنٹ ایگریکلچرل فارم موجود ہے اگر ہماری یونیورسٹی اپنے سائنس ڈپارٹمنٹ کے ماتحت زراعت کا ایک شعبہ کھول دے اور کم از کم اسکول کے درجوں تک اسے لازمی قرار دیدے تو ہم کو توقع ہے حکومت اور قوم دونوں ہر قسم کی مالی اور اخلاقی امداد دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں گی اور ہم کو امید ہے حکومت موجودہ ایگریکلچرل فارم کو ہماری بعض ابتدائی ضرورتوں کا کفیل بناوے گی۔ ہز اکسلنسی لارڈ ارون بالقابہ کی حکومت زراعت کی ترقی میں انتہائی دلچسپی لینے کے لئے آمادہ ہے۔ یہ بہترین موقعہ ہے کہ ہم اس شعبہ کو آسانی کے ساتھ قائم کر کے اپنے طلبا کو ایک نہایت ہی اہم اور مفید فن سے آشنا کرائیں اور ملک و ملت سے خراج تحسین و تشکر حاصل کرنے کے حقدار بنیں۔ ہمارے بزرگ محترم نواب سر محمد مزمل اللہ خانصاحب بہادر رئیس اعظم بھیکن پور ایک زبردست کارخانہ صنعت و حرفت

کے مالک ہونے کے علاوہ علی گڑھ کے سب سے بڑے زمیندار بھی ہیں ان سب باتوں کے علاوہ علی گڑھ کالج کے قدیم ترین مربی ہیں ممدوح نے ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ کے تحریک میں جس عالی حوصلگی اور وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے اس کی دوسری مثال امید ہے ممدوح خود اس شعبہ زراعت کے قیام و ترقی کی صورت میں پیش فرمائیں گے۔

حیدر آباد و عثمانیہ یونیورسٹی کو بعض حیثیات سے تمام ہندوستان میں ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے اس کے کارنامے اس وقت کسی تعارف یا تفصیل کے محتاج نہیں۔ لیکن جس چیز کی کمی اس وقت ہم محسوس کرتے ہیں وہ اس کا غیر معمولی قناعت اور خاموشی کے ساتھ محض اپنی مقامی حیثیت پر اکتفا کر لینا ہے لفظ "مقامی" کسی قدر خطرناک اور گمراہ کن ہے۔ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ اردو کی موافقت میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں "اردو علی غول" یا اردو سنگھٹن" قائم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ بلکہ محض اس اعتبار سے کہ وہ ہندوستانی زبان کی اعلیٰ تعلیم گاہ ہے جس کی خدمات مفید اور امید افزا ہیں، جس کے فارغ شدہ طلبا، اپنی استعداد اور قابلیت کے اعتبار سے کسی دوسری یونیورسٹی سے کم نہیں ہیں۔ جس کا معیار تعلیم بیرون

ہندوستان دیگر اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹیوں کے نزدیک بھی مسلم ہے جس کی بقا و قیام ایک ہندوستانی حکمراں کی فیاضی اور علم دوستی کا رہین منت ہے۔ اس کو حیدرآباد دکن کی حدود سے نکل کر اپنے مقاصد اور نصب العین سے دوسری علمی جماعتوں کو آگاہ اور آشنا کرانا چاہیئے۔ عام طور پر لوگ، اور اس میں بعض خاص خاص لوگ بھی شامل ہیں، ابھی ہندوستانی زبان اور اس کی اہمیت اور امکانات سے بے خبر ہیں۔ اس لئے ارباب یونیورسٹی کی خدمت میں ہم یہ ناچیز مشورہ پیش کرتے ہیں کہ وہ یونیورسٹی کے باکمال افراد اور اساتذہ کا کم سے کم ہندوستان کی دیگر تعلیم گاہوں میں اپنے خالص علمی نصب العین کی تفصیل و توضیح کے لئے دورہ کرائیں۔ یہ حضرات اپنے علمی مقاصد کا اظہار فرمائیں گے، دوسروں کے مفید خیالات اور مشورہ سے اپنی یونیورسٹی کو فائدہ پہنچائیں گے اس باہمی تبادلہ خیالات سے ہر ایک کو فائدہ پہنچے گا۔ اس کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کا ایک خالص علمی و ادبی اردو و انگریزی رسالہ ہونا چاہیئے جو یونیورسٹی کے مقاصد کا علم بردار اور اس کی کارگزاریوں کا ترجمان ہو۔ ہم کو امید ہے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد اس ناچیز مشورہ پر غور فرمائیں گے۔

پنڈت منوہر لال زتشی صاحب ایم اے سہیل کے ہوا خواہوں میں ہیں اور ہمارے مقاصد سے ہمدردی اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ سہیل کے دوسرے نمبر میں دو مضامین شائع ہوئے ہیں جن کے بعض فقروں سے آپ نے اختلاف کیا ہے۔ موصوف کے جملہ خطوط ہم لفظ بہ لفظ انھیں صفحات پر شائع کرتے ہیں۔ ہم اپنی طرف سے فاضل پنڈت کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ سہیل کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ کوئی بات ایسی نہ کی جائے جس سے ہندو مسلمانوں میں تفریق پیدا ہونے کا احتمال ہو بلکہ حتی الوسع صرف ایسی باتیں کی جائیں جن سے ان دونوں میں اتفاق و یک جہتی پیدا ہو۔ علمی اور ادبی نصب العین، مذہبی سیاسی یا معاشرتی نصب العین سے بالکل علیحدہ ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے ہم اسی اصول و عقیدہ کے پابند ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ زتشی صاحب کے اعتراضات بے جا ہیں ہاں ہم کو اس کا ضرور یقین ہے اگر آج ہندو مسلمانوں میں تفریق و کشاکش نہ ہوتی تو اس قسم کی شکایت اور بدگمانی کبھی نہ پیدا ہوتی اور زیادہ سے زیادہ اسے صرف "لطف داستان" کے ذیل میں جگہ دیدی جاتی۔ بہر حال موجودہ فضا اس کی مقتضی ہے کہ اس قسم کی بدگمانی یا "واقعہ" کا جلد سے جلد تدارک کر دیا جائے۔ اردو میں فارسی یا عربی کی کثرت یا ہندی و سنسکرت کی بھرمار ایسی چیزیں ہیں جن کو سنجیدہ اور وسیع النظر لوگ کبھی مستحسن نہیں سمجھتے لیکن اگر فریقین اس سے باز آنا پسند

نہیں کرتے تو اس کو بنائے مخاصمت قرار دینا بھی غلطی اور نادانی ہے۔ بذاتہ ہم اُردو کو ہندو اور مسلمان دونوں کی مشترکہ ملکیت سمجھتے ہیں اور دونوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی سمجھ و ایمان کے مطابق اس کی ترقی کی کوشش کریں گے۔ لیکن اس وقت تو اُردو کی حالت اس میت کی ہے جس کے مذہب وملت کی کسی کو خبر نہیں اور ہر فریق اپنے عقیدہ یا احترام کے سلسلہ میں نہیں بلکہ غفلت و نفسیات کی بنا پر اسے نذرِ آتش یا پیوندِ خاک کرنا چاہتا ہے!

سید احسن صاحب اگر ایک طرف نہرو و سپرو کے شاکی ہیں تو دوسری طرف ابو الکلام، سیماب کے بھی ماتم گسار ہیں۔ ہم کو یقین ہے انھوں نے سر سپرو اور پنڈت نہرو کی ذات کو مدنظر نہیں رکھا ہے بلکہ ان کا مقصد اس جماعت سے ہے جو سنسکرت یا ہندی کو بے جا طور پر اردو میں داخل کرنا چاہتے ہیں اس میں شک نہیں "نہرو" اور "سپرو" کے الفاظ گمراہ کن ہیں۔ احسن صاحب کا مقصد اصل میں "شیخ و برہمن" کی کشاکش سے ہے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ سر سپرو اور پنڈت نہرو دونوں اُردو ادب کے ہمدرد اور ہوا خواہ ہیں۔ ہماری نظر سے کوئی ایسی مثال نہیں گزری جس میں یہ دونوں بزرگ کم سے کم ایسی اُردو بولتے نہ ہوں جو ایک مسلمان کے لئے بھی باعث رشک نہ ہو بہر حال "وفاداری میں"

جہاں تک "شیخ و برہمن" کا تعلق تھا "آزمائش" ہو چکی
اب ہم سید اور پنڈت دونوں کو غالب کے ایک دوسرے شعر کی طرف متوجہ کرانا چاہتے ہیں جس میں اپنے مطلب کے مطابق تھوڑی سی تحریف بھی کر دی ہے ؎

زنار پھینک سبحہ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

پنڈت برج نرائن چکبست صاحب مرحوم کا کلام صبح وطن کے نام سے انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا ہے سرسپرو نے اس کا دیباچہ لکھا ہے، چکبست اردو کے بلند پایہ شاعر تھے ان کا مذاق پاکیزہ تھا، ان کے کلام میں ملک و ملت کی امید و امنگ جھلکتی ہے وہ خود نہایت سنجیدہ ذہین اور منکسر مزاج تھے، ان کو اردو سے الفت تھی، قابلیت کی قدر کرتے تھے مذہبی مناقشات سے دور تھے، ان کا مفہوم قومیت نہایت بلند تھا ملک و قوم میں زندگی کے آثار دیکھتے تو مسرور و بے اختیار ہو کر فرائض شعری و شاعری ادا کرتے تھے۔ افسوس ہے ایک ایسے زمانہ میں وہ ہم سے جدا ہوئے جب ان کی بڑی ضرورت تھی، اردو کو ان سے بڑی توقعات تھیں۔ صلح پسند اور وسیع النظر اردو دانوں کے لئے

ان کی ذات مغتنمات سے تھی۔ ان کی وفات اُردو کے لئے ایک ادبی حادثہ ہے جس کی تلافی شاید اس دور آشوب میں مدت تک نہ ہو سکے۔ ہم ان کے نجات ابدی کی دعا کرتے ہیں اور ان کے ادبی ترکہ صبح وطن کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں

نواب عماد الملک مولانا سید حسین بلگرامی مرحوم کی وفات ہمارے لئے ایک قومی اور ادبی حادثہ ہے' دائرۃ المعارف حیدرآباد ندوۃ العلماء لکھنو' دار المصنفین اعظم گڑھ' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ان کی علم پروری اور علم دوستی کی زندہ یادگار ہیں۔ تصانیف خسروی کی ترتیب' تصحیح و تدوین میں انھوں نے نواب محمد اسحق خاں صاحب مرحوم کی جس طور پر مالی اور اخلاقی مدد کی تھی وہ تمام پرستاران ادب اور اصحاب ذوق کے نزدیک مسلم ہے۔ مسلم یونیورسٹی' انجمن اُردوے معلیٰ اور خسرو کمیٹی نے مرحوم کی وفات پر اظہار تعزیت کے جلسے کئے اور اسے علی گڑھ کے ناقابل تلافی نقصان سے تعبیر کیا' مرحوم فرانسیسی' انگریزی' فارسی اور عربی کے باکمال ادیب تھے' وہ محض ادیب و انشا پرداز نہ تھے بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کے مدبر بھی تھے ان کے حسن انتظام سے حیدرآباد کو بعض پیچ در پیچ مسائل کے سلجھانے میں کامیابی ہوئی وہ حیدرآباد

کی علمی اور سیاسی دونوں جماعتوں میں ناگزیر سمجھے جاتے تھے، مرحوم کی وفات پر معارف کا حسب ذیل خیال حرف بحرف صحیح ہے۔

"مسلمانوں میں آج بہت سے لوگ ہیں جو مغربی علوم میں مہارت رکھتے ہیں، بہت سے لوگ ہیں جو قدیم مشرقی علوم سے واقف ہیں اور بہت سے لوگ ہیں جو سیاست و تدبر کے مرد میدان ہیں۔ لیکن صرف نواب عماد الملک ایک ایسے بزرگ تھے جو ان سب کا مجموعہ تھے۔ اس لئے ان کی وفات سے اس قحط الرجال میں جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ مدتوں خالی رہے گی اور اسلامی جماعت کے تمام حلقوں میں ایک مدت تک ان کی وفات پر ماتم کیا جائے گا"

خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

مرتب سہیل کی استدعا پر علی گڑھ میگزین کی جماعت عاملہ نے ایک گراں قدر رقم میگزین فنڈ سے سہیل کی بقا و ترقی کے لئے ہدیتہً منظور فرمائی ہے۔ سہیل اور میگزین دونوں مسلم یونیورسٹی میں اپنی اپنی بساط کے موافق اردو کی خدمت بجا لا رہے ہیں اور

اور اس وقت جب کہ ہر قسم کی دشواریاں ہم کو پیش آرہی تھیں میگزین کی یہ اعانت ہمارے انتہائی شکر گزاری کا باعث ہوئی۔ ہم ارباب میگزین کو یقین دلاتے ہیں کہ سہیل اور انجمن اُردوے معلیٰ دونوں ان کی خدمت کے لئے وقف ہیں۔ خدانا کردہ، اگر ان کو کبھی ہماری ضرورت محسوس ہوئی تو ہم امید کرتے ہیں ہم سے جو توقعات ہیں وہ انشاء اللہ تمام و کمال پوری کی جائیں گی۔ اس سلسلہ میں ہم سے فی الحال یہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ ان تمام طلبا کو جو علی گڑھ میگزین کے باضابطہ خریدار ہیں سہیل کا ہر نسخہ نصف قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں۔

۲۔ انٹرمیڈیٹ کالج اور یونیورسٹی میں طلبا کی جتنی انجمنیں ہیں ان کو سہیل ہدیتہً نذر کیا جائے گا۔

۳۔ ہم نے اپنی عرض داشت میں اس کا تذکرہ کر دیا تھا اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ متذکرہ صدر رعایات کے علاوہ ہم اپنی لبساط کے مطابق اور اپنی حدود کے اندر رہ کر ہر اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہیں جو ارباب میگزین، سہیل اور میگزین کی حالتوں کا اندازہ فرما کر ہم سے کریں۔

آخر میں ہم اپنے تمام طلبائے یونیورسٹی، انٹرمیڈیٹ کالج، میگزین

کی جماعت عاملہ بالخصوص پروفیسر محمدؐ حبیب صاحب (آکسن) قاضی جلال الدین صاحب، عبدالمجید قریشی صاحب پرنسپل انٹرمیڈیٹ کالج اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب سی آئی ای پرو وائس چانسلر وصاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے سپاس گزار ہیں کہ انھوں نے ہماری استدعا کو سیرچشمی کے ساتھ قبول فرمایا اور سہیل کی ایسے وقت دستگیری فرمائی جب ہم پر انتہائی سختیاں گزر رہی تھیں۔ خدا ان کو اجرنیک، ناظرین سہیل کو احساس ذمہ داری وخودداری اور مرتب سہیل کو خریداروں کی فراوانی عطا فرمائے۔ آمین۔

جواں بخت وجواں سال "پرنس" خدا کا شکر ہے۔ اب ہز ہائنس اور والی حکومت کی حیثیت سے سریر آرائے بھوپال ہوئے ہیں۔ ایک عام جلسہ تہنیت وتاجپوشی بھوپال میں منعقد ہوا جس میں رعایائے بھوپال، وابستگان دامن دولت، اہالیان علی گڑھ اور دیگر عمائد عظام شریک تھے، ہز ہائینس بالقابہا واجلالہا کے بصیرت افروز نصائح اور ہز ہائنس کے دل نشین اور امید افزا ارشادات سے حاضرین مستفید وشادکام ہوئے۔ موکب سلطانی نومبر میں علی گڑھ میں نزول اجلال فرمائے گا۔ جہاں ہز ہائنس نے سلطنت

پر حکمرانی کرنے سے پہلے دلوں پر حکمرانی کرنی سیکھی تھی۔ کیسی فرخ فال وہ ساعت ہوگی جب "سینہ چاکان چمن" سے "سینہ چاک" آملیں گے اور اس چمن کی ہر کلی ذرہ آشنا ہو جائیگی

اسی جشن اورنگ نشینی کے ساعت سعید میں "یاد ایامیکہ" ہمارے حاذق صاحب (مولوی محمدؐ حاذق صاحب ام اے ال ال بی علیگ لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ) نے بطور "تبریک تہنیت" ایک قصیدہ پیش کیا تھا جس کے صلہ میں بارگاہ سلطانی سے ایک ہزار روپیہ اور پانسو روپیہ کا خلعت عطا کیا گیا۔ ہم "ہم سبق" مداح کو مبارکباد دیتے ہیں اور ممدوح کی علیگ نوازی علم پروری اور کرم گستری کے بدل شکر گزار اور احسان مند ہیں۔

جب تک سہیل شائع نہیں ہوا تھا ہم انجمن اردوے معلیٰ کی طرف سے ہندوستان کے متعدد مقتدر اردو صحائف کے خریدار تھے۔ اب جب کہ خود انجمن کا رسالہ سہیل شائع ہونے لگا ہے ہم اپنے معاصرین سے استدعا کرتے ہیں وہ اپنے اپنے رسائل کے لئے زر نقد کے بجائے سہیل کا تبادلہ منظور فرمائیں۔ آیندہ سے ہم وی پی کے بجائے معاصرانہ اخوت کے متمنی و متوقع ہونگے

ہاں اگر ہمارے کرم فرماؤں میں سے کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ سہیل کی ایسی حیثیت نہیں ہے کہ وہ اپنے رسالہ کو سہیل کے تبادلہ میں دنیاپسند فرمائیں تو ان کے لئے گفت وشنید کی گنجائش ہے۔ اس سلسلہ میں ہم البتہ یہ اطلاع دے دینا چاہتے ہیں کہ اب تک جتنے اخبار یا رسائل نے ہم سے تبادلہ کی خواہش کی ہم نے ان کی استدعا بغیر کسی پس وپیش کے منظور کرلی۔

انھیں صفحات پر ناظرین روس کے مشہور افسانہ نگار ٹرگنف کا ایک افسانہ ایری آیڈنی ملاحظہ فرمائیں گے جس کا ترجمہ خواجہ منظور حسن صاحب ام اے علیگ نے کیا ہے۔ لبظاہر ناظرین اسے اکھڑا اکھڑا اور شاید بے کیف پائیں لیکن یہ ترجمہ عمداً ایسا کیا گیا ہے۔ ٹرگنف کا ایک مخصوص انداز بیان ہے اس کے جتنے تراجم روسی سے انگریزی میں ہوئے ہیں ان کے پڑھنے سے ایک خاص کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ٹرگنف کی انشاپردازی کا آرٹ یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے یہ معلوم ہوتا ہے گویا اس نے یہ باتیں تصنیف یا شائع کئے جانے کے لئے نہیں لکھی ہیں۔ وہ نہایت استغنا کے ساتھ ٹھیر ٹھیر کر، کبھی چونک کر اور کبھی جھرجھری لے کر اپنے بیانات اس طور پر دیتا ہے گویا چند اشخاص عوائد رسمیہ سے

بے نیاز ہو کر آپس میں باتیں کر رہے ہیں، وہ بھی اس انداز سے کہ کہنے والے کو اس کی پروا نہیں ہے کہ سننے والے اس کے خیالات سے ہمدردی رکھتے ہیں یا نہیں اس کو قابل التفات سمجھتے ہیں یا نہیں۔ یا خود بیان کرنے والا بھی اس کی پروا کرتا ہے یا نہیں۔ ٹرگنف ایک ہی وقت میں انشا پرداز بھی معلوم ہوتا ہے اور قصہ گو بھی، کہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پر مراق طاری ہے اور کہیں "مغز ہما" (افیون ؟) سے متاثر، کہیں مجذوب معلوم ہوتا ہے اور کہیں زندگی اور زمانہ کا بہترین مفسر و مصور اور مجموعی طور پر ایک بے نظیر افسانہ نگار۔

ترجمہ کہیں کہیں غیر مانوس معلوم ہوتا ہے، بعض ترکیبوں میں بھی غرابت نظر آئے گی ہم کو امید ہے ٹرگنف کے دلدادہ اس رنگ کو اردو میں دیکھنا پسند کریں گے تو رفتہ رفتہ یہ باتیں خود دور ہو جائیں گی۔ اردو میں نشانات وقف کم ہیں اس لئے پڑھنے میں اس کمی کو دور کر لینا چاہیئے۔ اس افسانہ سے لطف حاصل کرنے کے لئے ہم کو اس کے پڑھنے کا بھی ایک انداز خاص اختیار کرنا پڑے گا۔

۴

حکما نے بعض بیماریوں کا علاج بتایا ہے لیکن حکما اور رؤسا کا اس پر اتفاق ہے کہ مرض اگر دور نہیں ہو سکتا تو مدت حیات ضرور طویل بنائی جا سکتی ہے۔ شاید اسی قسم کی حیات کو "مرگ مسلسل" سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اردو اخبارات اور رسائل کو ایسی ہی زندگی تقدیر ہوئی ہے۔ "قضا" و قدر کے اس "پیام تہنیت" پر ہر مدیر یا مرتب خوش ہوتا ہے ہم بھی مسرور ہیں کہ موجودہ نمبر کے ساتھ سہیل کے چار نمبر نکل ہی گئے" اوقات اشاعت حسب اندیشہ یا توقع ہمیشہ ناہموار رہے اس سلسلہ میں خریداروں کی شکایت اور ہماری معذرت دونوں قابل اعتنا نہیں کیونکہ یہ اکثر پیش آتی رہتی ہیں اور جو واقعہ اس تواتر و تسلسل کے ساتھ پیش آئے اس پر ہنسنا چاہیئے یا صبر و شکر سے کام لینا

چاہیئے۔ بعض کرم فرماؤں نے اس اصول کو عمداً یا سہواً نظرانداز کیا، ان سے خانہ جنگی تک نوبت آئی جس کا انجام یہ ہوا کہ فریقین میں سے کسی کو اعلان فتح یا اعتراف شکست کی ہمت باقی نہیں رہی۔ بہر حال سوال ایک یا دو سال کا نہیں ہے یہ تو زمان ومکاں کے مغالطے ہیں جن کو ریاضی یا ہندسہ نے بسلسلۂ "حفاظتِ خود اختیاری" سند جواز دے رکھی ہے ورنہ اہل "مذاق" جانتے ہیں حکیم آئن اسٹائن اور اڈیٹران اخبار ایک ہی مغالطے کے دو پہلو ہیں۔ سہیل نکالنے سے ہمارا مقصد اردو اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمت ہے۔ ہر خدمت کا اندازہ خدمت کرنے والے کی بساط سے کیا جاتا ہے اس اعتبار سے ہم مسرور ہیں کہ اگر ہم دوسروں کی توقعات پوری نہ کر سکے تو یہ کیا کم ہے کہ خود اپنے آپ سے کسی نہ کسی حد تک مطمئن رہے۔

سہیل کی پذیرائی نہایت امید افزا ہوئی اگر تمام مقتدر رسائل اور انشاپردازوں کے خیالات یہاں نقل کیے جائیں تو کم سے کم سہیل کا ایک جزو اس کی نذر ہو جائے، جہاں تک علم وادب کا تعلق ہے ہم اشتہار بازی کے خلاف ہیں۔ ہماری دلی تمنا اور کوشش رہی ہے کہ سہیل میں کسی قسم کا اشتہار شائع نہ ہو اور نہ خود سہیل کا اشتہار کہیں دیا جائے۔ یہاں تک

کہ ہم سہیل میں کتابوں کا بھی اشتہار نہیں شائع کرتے۔ ہمکو معلوم ہے کہ اس سے ہمکو مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن اسکو کیا کیجائے اشتہار کی آلودگی کسی طور پر گوارا نہیں ہوتی ہاں اتنی کوشش ضرور ہی کہ سہیل خود اپنا اشتہار ثابت ہو۔ آیندہ کیلئے ہمکو نہیں معلوم ہم یا سہیل کس سطح پر اتر آئیں گے فی الحال تو اسی اصول پر قائم رہنے کا ارادہ ہے

ہندوستان میں اسوقت جتنے اُردو رسائل نکل رہے ہیں شاید ان سب سے کم سہیل کے خریدار ہیں ممکن ہی اس کا سبب یہ ہو کہ ہم نے اس کا اشتہار نہیں دیا یا اس کی اشاعت میں کوشش نہ کی یا ابھی اردو داں حضرات اس قسم کا رسالہ قبول کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہیں۔ بہرحال اول ۲ دو وجوہ تو صحیح ہیں تیسرے سبب کے ہم قائل نہیں ہیں بے موقع نہ ہوگا اگر ہم اپنی اس کوشش کا بھی یہاں تذکرہ کردیں جو خریداروں کے حاصل کرنے میں ہم نے کی۔ سہیل نکلا تو ہم نے اپنے عزیز دوستوں سے فرمائش کی کہ وہ کم سے کم ایک درجن خریدار اپنے احباب اور اعزا میں سے ایسے پیدا کریں جو بغیر اس خیال کے کہ سہیل دوسری بار شائع ہو بھی سکے گا یا نہیں سہیل کا وی پی وصول کریں۔ اس اسکیم میں تقریباً ۹۰ فیصدی کامیابی ہوئی سہیل نکلتا رہا اور رفتہ رفتہ سال کے آخر تک کم وبیش ڈیڑھ سو خریدار پیدا ہو گئے۔ ایک گراں قدر رقم بطور امداد علی گڑھ میگزین کمیٹی نے دی۔ ایک معقول رقم ہمارے دیرینہ دیوانہ دوست اور ٹینس نواز مکرم عالی جناب آنریبل نواب احمد سعید خاں صاحب سی۔ آئی۔ ای رئیس اعظم چھتاری وہوم ممبر حکومت صوبجات متحدہ نے مرحمت فرمائی ابتدائے

کار میں ہماری استدعا پر مسلم یونیورسٹی نے انجمن اُردوئے معلیٰ کے دارالمطالعہ اور سہیل کے ابتدائی اخراجات کے لئے ایک رقم یک مشت منظور کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی نے اس وقت ہمارے ساتھ ہمدردی نہ کی ہوتی تو سہیل شائع بھی نہ ہوتا اس کے بعد ہم اپنے قلمی معاونین کے شکر گزار ہیں جن کے نوادرِ فکری کا سہیل حامل رہا۔ ہم کو معلوم ہے بغیر کسی نقدی معاوضہ کے مقتدر اہل قلم سے کسی اعانت کی توقع رکھنی بے جا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے روپیہ پیدا کرنے کے جو ذرائع ہم کو حاصل ہوسکتے تھے یعنی خیرات، قرض یا سرقہ وہ سب مینیجر صاحب یونیورسٹی پریس کی بیدریغ طلبی کے نذر ہوتے ہیں بالخصوص جب سے وہ حج سے واپس آئے ہیں۔ اصحاب کرم اور ارباب قلم کے لئے تو صرف....

درودے میتواں گفتن، سجودے میتواں کردن

آخر میں ہماری استدعا ہے کہ ہمارے احباب و کرم فرما ہم سے ناممکن کو ممکن کر دکھانے کا مطالبہ نہ فرمائیں۔ ہم سے جہاں تک ممکن ہوسکے گا ہم اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے، انصاف تو یہ چاہتا ہے کہ وہ بھی اسی اصول کو مدنظر رکھیں لیکن اگر ایسا نہ ہوسکے تو کم سے کم تعویق اشاعت پر غیر شاعرانہ طور پر گھبرایا تو نہ کریں۔

ایک نہایت ضروری، مفید اور قابل تحسین تحریک جو کچھ دنوں سے حکومت صوبجات متحدہ کی کونسل میں پیش تھی۔ بالآخر بر روے کار آئی ہندوستانی اکیڈمی کا ایک سرسری خاکہ اس سے قبل انھیں صفحات پر آچکا ہے۔ ۲۲ جنوری ۲۷ء کے گورنمنٹ گزٹ میں اس کے متعلق جو سرکاری اعلان ہوا ہے اس کا جستہ جستہ اقتباس ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

ہندوستانی اکیڈمی کے قیام سے حکومت کا منشا اُردو اور ہندی ادبیات کی توسیع و ترقی میں معین ہونا ہے اس مقصد کو حاصل کرنے میں جس طریقہ کار کی ضرورت ہوگی اکیڈمی خود اس کو متعین کرے گی۔ باشتراک و باتفاق وزراے خود گورنر بہادر صوبجات متحدہ نے من جملہ دیگر ذرائع اور وسائل کے جو اس مقصد کی کامیابی میں معین ہو سکتے ہیں حسب ذیل تجاویز بطور مشورہ پیش فرمائی ہیں۔

(۱) مخصوص مضامین پر بہترین کتاب پیش کرنے کا انعامی مقابلہ

(۲) تنخواہ دار مترجمین کے اردو اور ہندی تراجم کی طباعت و اشاعت

(۳) ہندی یا اُردو ادبیات میں طبع زاد مضامین یا تراجم کے منتقل کیے جانے میں معین ہونا اس کی صورت، خواہ یہ ہو کہ یونیورسٹیوں یا انجمنوں کو مالی امداد دی جائے

یا کوئی اور صورت۔

(۴) اکیڈمی میں مشہور و مقتدر انشاپردازوں کا شمول بطور رفقا (فیلوز)

اکیڈمی حسب ذیل جماعتوں پر مشتمل ہوگی۔

۱۔ کونسل

۲۔ جماعت عاملہ

۳۔ رفقا جن کا انتخاب کونسل کرے گی۔

۱۔ کونسل کے پیش نظر وہ مسائل ہوں گے جو اکیڈمی کی عام پالسی سے متعلق ہوں۔ کونسل' ایک پریسیڈنٹ' چھ ممبران (بحیثیت اپنے عہدہ کے) تیس اراکین اور ایک جنرل سکرٹری پر مشتمل ہوگی۔ یہ پوری جماعت حکومت کی نامزد کردہ ہوگی کونسل کو چھ دیگر اراکین کو شریک کار بنانے کا اختیار حاصل ہوگا۔ کونسل کا جلسہ سال میں دوبار ہوگا۔ وقت اور مقام کا تعین پریسیڈنٹ کرے گا۔

۲۔ جماعت عاملہ' ایک چیرمین' ایک سکرٹری' ایک خازن اور اور چھ اراکین پر مشتمل ہوگی جس کا انتخاب حکومت کرے گی پالسی کے متعلق کونسل کی جو قراردادیں ہوں گی اور اکیڈمی کے دیگر امور کی بجا آوری اس کے فرائض ہونگے پریسیڈنٹ کی ہدایت کے مطابق اس کے جلسے منعقد ہوا کریں گے۔ جماعتِ

عاملہ اپنے فرائض کے مختلف شعبہ جات کے انتظام و انصرام کے لئے سب کمیٹیاں قائم کر سکے گی اس کے لئے وہ ایسے اشخاص کو بھی اپنا شریک کار بنا سکتی ہے. جو کونسل کے ممبر نہ ہوں۔ کونسل کا پریسیڈنٹ بحیثیت اپنے عہدہ کے جماعت عاملہ کا صدر ہوگا اور جنرل سکرٹری (بحیثیت اپنے عہدہ کے) اس کا سکرٹری اور خازن۔

اکیڈمی کے لئے حکومت نے پچیس ہزار کی رقم علحدہ کردی ہے جس کو مجلس واضعانِ قانون نے منظور کر لیا ہے۔ یہ رقم حکومت کی مقرر کردہ شرائط پر ادا کردی جائیگی. حکومت نے (باشتراک و باتفاق وزراے خود) سر تیج بہادر سپرو کو صدر ڈاکٹر تاراچند صاحب کو اکیڈمی کا سکرٹری اور حسب ذیل حضرات کو ارکین مقرر کیا ہے۔

۱۔ جناب آنریبل وزیر تعلیمات صاحب صوبہ جات متحدہ

۲۔ جناب ڈائرکٹر صاحب تعلیمات

۳۔ جناب وائس چانسلر صاحب بہادر الہ آباد یونیورسٹی۔

۴۔ جناب وائس چانسلر صاحب بہادر لکھنؤ یونیورسٹی۔

۵۔ جناب وائس چانسلر صاحب بہادر ہندو یونیورسٹی۔

۶۔ جناب وائس چانسلر صاحب بہادر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

ہم یہاں صرف ان حضرات کا نام درج کرتے ہیں جو (غالباً) اکیڈمی کے شعبۂ اردو کے ممبر ہیں۔

(۱) مسعود حسن صاحب ریڈر لکھنؤ یونیورسٹی۔
(۲) سر عبدالرؤف صاحب الہ آباد۔
(۳) بابو دھنپت رائے صاحب بی اے عرف "پریم چند" بنارس۔
(۴) سید ضامن علی صاحب ام اے لکچرر اُردو۔ الہ آباد یونیورسٹی۔
(۵) منشی دیا نرائن نگم صاحب اڈیٹر زمانہ کان پور۔
(۶) سید سجاد حیدر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔
(۷) پنڈت منوہر لال زتشی صاحب ام اے آئی ای ایس پرنسپل جوبلی انٹرمیڈیٹ کالج لکھنؤ۔
(۸) مولانا مہدی حسن ناصری صاحب یو' پی' ای' ایس ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی۔
(۹) مولٰنا عبدالماجد صاحب بی اے دریاباد' بارہ بنکی۔
(۱۰) مولوی نیاز محمدؐ خاں صاحب فتحپوری
(۱۱) مرزا محمدؐ عسکری صاحب حکیم عبدالعزیز روڈ لکھنؤ۔
(۱۲) مولانا سید آل نقی صاحب عرف مولانا صفی مولوی گنج لکھنؤ
(۱۳) مولانا محمدؐ نعیم الرحمٰن صاحب لکچرر عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی
(۱۴) مولوی نورالحسن صاحب نیرؔ بی۔ اے ال ال بی آنریری اسسٹنٹ کلکٹر کاکوری ضلع لکھنؤ۔
(۱۵) رشید احمدؐ صدیقی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ

جماعت عاملہ کے اراکین کا نام عنقریب شائع ہوگا۔

اس سال انجمن اُردوے معلیٰ نے اُردو کانفرنس کا دوسرا اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ ۲۶، ۲۷ دسمبر کو بصدارت مولانا نور الحسن صاحب نیّر بی اے ال ال بی مولف نور اللغات دہلی میں منعقد کیا فاضل صدر کا خطبہ انھیں صفحات پر کہیں نظر آئیگا اس میں شک نہیں فرائض صدارت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فاضل ممدوح کو بہت کم وقت ملا تاہم خطبۂ صدارت عام طور پر نہایت مقبول ہوا۔ ہم جملہ اراکین انجمن کی طرف سے ممدوح کے شکر گزار ہیں۔

حسب ذیل عمائدین کی وفات پر کانفرنس نے اظہار تاسف وہمدردی کیا۔

۱۔ نواب عماد الملک بہادر بلگرامی۔
۲۔ پنڈت برج نرائن چکبستؔ لکھنوی۔
۳۔ مولانا عبد الحلیم صاحب شررؔ لکھنوی۔

حسب ذیل تجویز من جانب صدر پیش ہو کر منظور ہوئی

(یہاں تجاویز کی محض تلخیص پیش کی جاتی ہے)

۱۔ یہ کانفرنس صوبجات متحدہ میں ہندوستانی اکیڈمی۔

کے قیام پر اظہار مسرت کرتی ہے اور آنریبل رائے راجیشور بلی صاحب بہادر وزیر تعلیمات کو مبارک باد پیش کرتی ہے کہ ان کے اتفاق و ہمدردی سے یہ اسکیم بر روئے کار آئی۔

۲۔ ایک کمیٹی چند حضرات کی بنائی جائے جو اُردو کو عام فہم اور اس کے رسم الخط کی مشکلات رفع کرنے کے ذرائع و تدابیر تجویز کرے۔ کانفرنس حسب ذیل ممبران تجویز کرتی ہے بقیہ نام سکرٹری اور جناب صدر کی رائے و انتخاب پر موقوف ہیں۔

(۱) مولانا سید طفیل احمد صاحب (علیگ) ام ال سی۔

(۲) خانصاحب میر ولایت حسین صاحب بی۔ اے

(۳) مولانا نظامی صاحب بدایونی۔

(۴) عباس حسین فاری صاحب اڈیٹر قوم دہلی۔

(۵) محمود احمد عباسی صاحب۔

۳۔ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ ہر شہر و ہر محلہ میں انجمنیں و کلب قائم کئے جائیں جن میں دار المطالعہ کا انتظام ہو، اُردو اخبارات و رسائل منگائے جائیں اور تحریر و تقریر میں کافی سہولتیں مہیا کی جائیں۔

۴۔ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پنجاب یونیورسٹی کی مانند اُردو کے خاص امتحانات کھولے جائیں

کامیاب طلبا کو ڈپلوما اور اسناد دی جائیں

۵۔ مسلم یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ کورس میں اختیاری مضامین کے سلسلہ میں اُردو بھی شامل ہو اور ایک اُردو فیکلٹی قائم کی جائے۔

جہاں تک "ہنگامہ" پر "گھر کی رونق" کا مدار ہے ہماری کانفرنس ہر طور پر کامیاب رہی۔ اسی سلسلہ میں مشاعرہ کو بھی شامل کر لینا چاہیے راقم الحروف کانفرنس کے دوران میں علیل رہا اور باوجود کوشش و تمنا کے اس میں شریک نہ ہو سکا۔ کانفرنس کو جملہ مراحل سے کامیابی و کامرانی کے ساتھ گزارنے میں مشیر احمد صاحب علوی اسسٹنٹ سکرٹری انجمن اُردوے معلیٰ نے جس خلوص و جانفشانی سے کام کیا ہے اس کے ہم سب شکر گزار ہیں۔

ہمارا خیال ہے کانفرنسوں اور کانگریسوں کا موزوں ترین فرض اب صرف "اظہارِ مسرت" یا "اظہارِ ماتم" رہ گیا ہے "ذائقہ منہ کا بدلنے کے لئے" "اظہارِ نفرت و ناراضی" بھی کبھی کبھی شامل کر لینا چاہیئے اور بس۔

انجمن اُردوے معلیٰ کے سلسلہ میں جس کانفرنس کی طرح ڈالی گئی ہے، اُس سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ حالت یہ ہے کہ جب ایسی کانفرنس جس میں کام کرنے والوں اور دولت کی کمی نہیں ہے

وہ بھی کسی نہ کسی سبب سے اپنے مقاصد میں کامیاب رہنے سے مجبور رہتی ہے تو پھر ایک ایسی جماعت یا انجمن کا کیا تذکرہ جس کے پاس اپنے نام کے سوا کچھ نہیں ہے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انجمن اُردوئے معلیٰ اُردو کانفرنس کا شمول محض اس بنا پر ہے کہ اس طور پر ہم مالی مصارف سے محفوظ رہتے ہیں اور ؎

زمینِ گورِ غریباں پہ ایک جا نہ ٹھہر
یہیں کہیں نگہِ شرمسار ہم بھی ہیں

کے مصداق "نگہ شرمسار" کے لئے "دعوت دید" دینے "یہیں کہیں" موجود ہوتے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا "چابک سواراں یک طرف" "تمکین گدایاں یک طرف" کے سلسلہ میں ہم جہاں کے تہاں رہ گئے۔

۱۹۲۶ء میں دلی میں جلسہ ہوا لیکن "دلی دورست" ہونے کے باوجود بھی ہم "پانچویں سوار" کی حیثیت سے پہنچ ہی گئے اور جو کچھ کر سکتے تھے کر دھر آئے۔ آئندہ سال سنتے ہیں کانفرنس کا اجلاس مدراس میں ہوگا اس کے بعد ممکن ہے دوسری نشست کولمبو یا ٹمبکٹو میں ہو "گدائے گوشہ نشیں" کا "خروش" تو علی گڑھ

ہی تک محدود رہے گا۔

ہر کانفرنس یا اس قسم کی دوسری جماعتوں کے پیش نظر ایک مقصد ہوتا ہے۔ اس مقصد کو مدنظر رکھکر اس کے اراکین اور بہی خواہ مختلف ذرائع اور وسائل بر سرِ کار لاتے ہیں، اس کے لئے معقول آدمی اور معقول رقم کی ضرورت ہوتی ہے جہاں تک ان اسباب کا تعلق ہے ہماری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو کوئی شکایت نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آج سے تقریباً نصف صدی قبل جو مقصد ہمارے پیش نظر تھا کیا وہی مقصد بجنسہٖ ہمارے سامنے اب بھی ہے اور کیا قوم و ملک کو اس کی ضرورت بھی ہے۔ کانفرنس کا اولین مقصد مسلمانوں میں تعلیم بالخصوص انگریزی تعلیم کو مقبول بنانا تھا، وہ مقصد ایک معقول حد تک حاصل ہوگیا۔ ام اے او کالج، مسلم یونیورسٹی کی حد تک پہنچ گیا زمانہ اور حالات دونوں بدل گئے اب ہم کو اپنے نصب العین پر غور کرنا چاہیئے اور محض سالانہ جلسوں پر اکتفا نہیں کرنی چاہیئے۔ ملک و قوم کی سیاسی و معاشرتی ترقی کے ساتھ ملک کے نظام تعلیم پر بھی نظرثانی کرنی لازمی ہے۔ کانفرنس کے سامنے آج یہ مسئلہ ہونا چاہیئے کہ کس طرح مسلمانوں میں تعلیم کا اصلی مفہوم اور اس کا صحیح

مقصد مقبول بنایا جائے۔ لیکن اگر ہمارے اس خیال سے کسی کو محض اس بنا پر اختلاف ہو کہ یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ، دشوار اور شاید اندیشہ ناک بھی ہے تو جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی کہہ آئے ہیں کانفرنس اب اعلیٰ تعلیم کے بجائے عوام کو محض نوشت خواند کی طرف مائل کرائے۔ اعلیٰ تعلیم ضرورت سے زیادہ مقبول ہو چکی ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ کثرت سے پڑھے لکھے مسلمان پیدا کئے جائیں۔ بالفاظ دیگر اب کانفرنس کو صرف ابتدائی تعلیم کی نشر و اشاعت کرنی چاہیئے اور بہت چھوٹے چھوٹے مقاصد کو بڑے سے بڑے پیمانہ پر شروع کرنا چاہیئے کچھ اور نہیں تو اردو ہی کی توسیع و اشاعت اور اس کے مقاصد کی نگہداشت کانفرنس اپنا نصب العین بنائے۔ اس سلسلہ میں ابتدا یوں کرنی چاہیئے کہ نہایت غور اور اہتمام کے ساتھ اس کو ایک ایسا تدریجی نصاب درس بچے اور بچیوں کے لئے تیار کرنا چاہیئے جس کو معمولی سے معمولی لوگ بھی پڑھکر دکم سے کم وہ لوگ جو اسکول میں نہیں پڑھ سکتے یا معلم رکھنے کی قدرت نہیں رکھتے، فائز المرام ہو سکیں۔ اسی سلسلہ میں ضمنی طور پر صنعت و دستکاری کا شعبہ بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

یہ سب تو اس کانفرنس کے لئے تھا جس کی ذمہ داری تمام ملک

و قوم سے وابستہ ہے۔ انجمن اُردوے معلیٰ اُردو کانفرنس کا مقصد ایک بڑی حد تک محدود ہے۔ انجمن اُردوے معلیٰ مسلم یونیورسٹی کی ایک خالص علمی جماعت ہے جس کا مقصد صرف ان امور کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال ہے جو مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے متعلق ہیں اور اپنی ہمہ گیری کے اعتبار سے اُردو علم و ادب سے وابستہ ہیں، ہمارا کام علمی تفتیش تفحص و تحقیقات ہے اس اعتبار سے ہمارا مقصد وہی ہے جو اورنٹیل کانفرنس یا اس قسم کی دوسری علمی جماعتوں کا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری انجمن اور ہمارے کارنامے مسلم یونیورسٹی کی ان تمام جماعتوں کے علمی خدمات کا آئینہ ہوں جو علوم و فنون کی ترقی و توسیع میں معین ہوں، علمی تحقیقات و علمی کارناموں کے اعتبار سے ہماری یونیورسٹی ہندوستان کی کسی یونیورسٹی سے پیچھے نہیں ہے۔ یہ ہماری یونیورسٹی کی بدنصیبی ہے کہ اس کے اساتذہ کے علمی کارنامے اب تک قوم و ملک کی نظروں سے پوشیدہ رہے ہیں۔ اس کا سبب محض یہ ہے کہ اب تک یونیورسٹی کا کوئی ایسا علمی رسالہ نہ تھا جو ان بیش بہا علمی خدمات کو قوم و ملک کے سامنے پیش کرتا، بعض اسباب اور بھی ہیں لیکن وہ ایک حد تک "غیر متعلق" یا پھر ضرورت سے زیادہ "متعلق" ہیں۔ اس لئے ان کا تذکرہ کرنا

بے سود بھی ہے اور غیر محفوظ بھی آئندہ نمبر میں ہم تفصیل وار بیان کرینگے کہ ہماری یونیورسٹی کے علمی طبقے نے کس کس قسم کی علمی و فنی تحقیقات کی ہے اور ان کا کیا پایہ ہے۔

نظر براں ہماری انجمن اور کانفرنس کا مقصد وحید یہ ہے کہ ہم نے اور ہماری یونیورسٹی نے اپنے ناگزیر حدود کے اندر رہ کر اُردو علم و ادب کی کیا خدمات کیں۔ یہی نہیں بلکہ ہم کوشش کرینگے کہ اُردو علم و ادب کی توسیع و ترقی سے متعلق جو مسائل بیرون یونیورسٹی پیش ہیں ہم ان کے تصفیہ میں اپنے حدود کے اندر رہ کر کس طرح معین ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کام آسان نہیں ہے اور ہمارے وسائل محدود نہیں بلکہ ایک بڑی حد تک معدوم ہیں تاہم ہم کوشش کریں گے کہ اس فرض سے کسی نہ کسی حد تک سبکدوش ہوتے رہیں۔ وما توفیقی الا باللہ

ہمیں دلی مسرت ہے کہ ہماری گزشتہ تحریک بر روئے کار آئی، مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے جرمن فرنچ اور ترکی جماعتوں کا افتتاح و نفاذ منظور فرمالیا ہے۔ موجودہ دور میں ان زبانوں کے سیکھنے کی ضرورت اظہر من الشمس ہے جس کی اہمیت کا تذکرہ ہم اپنی پچھلے نوٹ میں کر آئے ہیں۔ ابھی یہ طے

نہیں ہوا ہے کہ ان کو کیا حیثیت دی جائے گی آیا ان کو ضمنی حیثیت دی جائے گی یا یہ بطور اختیاری مضامین کے داخل نصاب ہوں گی۔ بہرحال ہم جزئیات میں پڑنا نہیں چاہتے اور نہ اس کی ضرورت ہے، مقصد یہ ہے کہ ان کی تعلیم کا انتظام ہو، ہم اپنے بزرگ محترم و مشہور ادیب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی اے کے شکرگزار ہیں کہ موصوف نے ترکی سکھانے اور پڑھانے کا اپنے لئے کوئی معاوضہ گوارا نہیں فرمایا، خدا کرے ان کے اس ایثار سے ترکی ادبیات کو ہماری یونیورسٹی میں قبول عام نصیب ہو آمین۔

انھیں صفحات پر کہیں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اور مولانا مسعود علی ندوی صاحب کا مطبوعہ گشتی مراسلہ نظر آئے گا ہم کو امید ہے ہمارے علم دوست ناظرین اس مراسلہ کا غور اور ہمدردی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے، اس وقت ہندوستان میں اپنی قسم کی صرف دو علمی جماعتیں ایسی ہیں جن پر ہم کو بجا طور پر ناز ہے، ایک دار المصنفین اعظم گڑھ اور دوسری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ ان دونوں کی خدمت ہمارا فرض اولین ہونا چاہیئے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر دار المصنفین ہے دار المصنفین

کو اس وقت اپنے علمی و گرانبہا کتب خانہ کے لئے ایک مستقل عمارت کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ دار المصنفین جس خلوص و خاموشی سے اس وقت ہر قسم کی علمی و مذہبی خدمات بجالا رہا ہے اس کا اندازہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اس قسم کے کاموں کی اہمیت اور دقت سے آشنا ہیں۔ اردو علم و ادب میں دار المصنفین نے جس سنجیدہ، دقیق اور بیش بہا سرمایہ کا اضافہ کیا ہے اس کا اندازہ صرف اس طور پر کیا جا سکتا ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض کریں کہ دار المصنفین کا وجود نہ تھا اور نہ ہے ہم دار المصنفین اور اس کے سربرآوردہ اراکین کے ابتدائی دور سے واقف ہیں ان میں سے بعض نے صرف دار المصنفین کے لئے جس ایثار و قربانی سے کام لیا ہے وہ ممکن ہے کبھی تاریخ کے صفحات پر نہ آئے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان حضرات نے دنیاوی جاہ اور ذاتی رفعت کی توقعات کو کس استغنا اور سیر چشمی کے ساتھ متعدد بار ٹھکرایا ہے۔

دار المصنفین نے چندہ کی کوئی درخواست نہیں کی ہے۔ لیکن اگر وہ کرتا تو جائز بھی تھا۔ بہر حال وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ آپ بیس روپیہ ادا کر کے سال بھر کے لئے اس کے رکن بن جائیں جس کے معاوضہ میں انجمن کا مشہور ادبی و علمی رسالہ معارف اور

اور اس سال کی تمام تصانیف آپ کی خدمت میں ایک سال تک ہدیتہً ارسال ہوتی رہیں گی۔ ہماری استدعا ہے ہمارے ناظرین اس علمی اعزاز اور علمی خدمت میں اپنی اپنی بساط کے مطابق ضرور شریک ہوں گے۔

ہم کو یہ معلوم کرکے انتہائی مسرت ہوئی کہ حال ہی میں ہز اکسیلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب بہادر بالقابہ نے انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد دکن) کو پانچ ہزار روپیہ کی گراں قدر رقم عطا فرمائی۔ اس قسم کی انجمن کے لئے اس قسم کا عطیہ شاید اپنی آپ مثال ہے۔ اس علم دوستی اور علم پرستی پر ہم ممدوح کی خدمت میں سپاس گزاری کا ہدیۂ محقر پیش کرتے ہیں اور محترمی مولوی عبد الحق صاحب بی اے علیگ سکرٹری انجمن ترقی اُردو کو مبارک باد۔

ہم کو یاد ہے ہمارے مشہور علم دوست اور ادیب بزرگ محترم عالی جناب نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بہادر رئیس اعظم بھیکن پور و وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی دو تین سال ہوئے ایک گراں قدر رقم انجمن ترقی اُردو کو مرحمت فرمائی تھی ایک زمانہ میں ممدوح نے علی گڑھ میگزین کو بھی قلمی اعانت سے سرفراز کیا تھا ہم تو نواب صاحب بالقابہ کی خدمت میں سہیل

کی طرف سے صرف یہ عرض کریں گے ؂

اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یارب
درو دیوار دیئے اب انھیں ویرانی دے

ہم "درو دیوار" کے مستحق نہیں ہیں تو کیا "ویرانی" کی بھی التجا نہیں کر سکتے؟

گزشتہ تقریب تقسیم اسناد کے موقع پر ہز ہائنس والیٔ بھوپال اور ہماری "مادر مشفقہ" ہز ہائنس بیگم صاحبہ بالقابہا و اجلا لہا نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے "کلاہ گوشہ دہقاں" کو "آفتاب" تک پہنچا دیا۔ ہز ہائنیس بالقابہ نے دو لاکھ کا گراں قدر و شاہانہ عطیہ یونیورسٹی کو ارزانی فرمایا۔ ہز ہائی نس نے اپنے بزرگانہ اور مادرانہ نصائح سے ہمارے قلوب کو روشن کیا ہز ہائنس کو خدائے برتر و توانا اس سے زیادہ جاہ و ثروت عطا فرمائے ہم سے زیادہ اس کا کون متمنی ہو گا۔ لیکن ہم سب نے یہ محسوس کیا کہ ہم میں ایک والیٔ ملک نہیں موجود ہے بلکہ ایک غمگسار باہمت عالی منش، غیور اور جاں نثار بھائی اور علی گڑھ کا کھیلنڈرا آ کر مل گیا ہے اور خاندان کے چھوٹے بڑے اپنے اپنے طور پر خوشیاں منا رہے ہیں ہم تو باوجود کوشش کوئی بات ایسی دریافت نہ کر سکے جس سے

ہز ہائی نس اور "پرنس" میں کوئی فرق نمایاں ہوسکتا۔ ہز ہائی نس کرکٹ اور ٹینس بھی کھیلے، یونین بھی تشریف لائے، تقریریں فرمائی گھومے پھرے ملے ملائے لیکن ہم نے یہی محسوس کیا اور اب بھی محسوس کرتے اور محظوظ ہوتے ہیں گویا ہم تھے "پرنس" تھے اور ام اے او کالج تھا۔ شاید کالج کا "دن پھرنا" اسی کو کہتے ہیں۔

ہمارے ناظرین کرام یہ سنکر نہایت مسرور ہوں گے کہ گورکھپور کے مشہور علم دوست رئیس جناب علامہ سید سبحان اللہ صاحب نے اپنا بیش بہا مشرقی کتب خانہ ہماری یونیورسٹی کو عطا فرمایا ہے۔ کالج کے شعبہ علوم مشرقی نے ممدوح کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا اور ممدوح کی اس بے نظیر فیاضی کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

ممدوح نے سہیل کو پسند فرمایا اور مبلغ ایک سو روپیہ بطور اعانت ارزانی فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ ہم ممدوح کے بدل شکر گزار ہیں۔ اس قیمتی کتب خانہ کا ایک نمونہ مثنوی بوستانِ خیال ہے جسے مولانا احسن صاحب قبلہ نے ایک مختصر مقدمہ تحریر فرما کر سہیل میں شائع ہونے کے لئے عطا فرمایا ہے۔ ہم کو امید ہے ہم آیندہ نمبروں میں اس کتب خانہ کی وہ چیزیں پیش کرینگے جو مفید اور دلچسپ ہونگی بمصداق ؎

برنگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را

مولانا عبد الحلیم صاحب شرر اور سید علی محمد خانصاحب شاد دنیائے اردو کی دو جامع ہستیاں اس بساط فانی سے اٹھ گئیں ابھی ہم چکبست کو نہیں بھولے تھے کہ یہ سانحات پے بہ پے پیش آئے، اس میں شک نہیں موت بے وقت نہیں آتی۔ لیکن دنیاوی نقطہ نظر سے ہم ہمیشہ محسوس کرتے ہیں کہ مرنے والے کو ابھی مرنا نہیں چاہیئے تھا، بہرحال قضا و قدر کی مصلحت ہماری کمزوری سے بہت بلند ہوتی ہے پردۂ غیب سے جو کچھ بر آمد ہوتا ہے وہ بہتر ہوتا ہے۔ شاید محض اسی بنا پر کہ وہ بہتر نہ ہوتا تو وقوع پذیر نہ ہوتا۔ خدا مرحومین کو آخرت کے اعلیٰ مدارج عطا فرمائے۔ آمین۔

شرر و شاد کی جدائی ہم پر یوں شاق ہے کہ علمبرداران علم و ادب کی مختصر جماعت مختصر تر ہوگئی۔ لیکن ہم کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ لکھنؤ اور عظیم آباد میں مرحومین کے نام لیوا مرحومین کی یادگار قائم کرنے میں ساعی ہیں۔ ماتم کرنے والے اپنے ماتم میں اسی وقت حق بجانب ہیں جب وہ مرنے والے کی زندگی سے خود بیدار ہوں اور دوسروں کو بیدار کریں۔ ہم

مرحومین کے احباب و اعزا سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

اس نمبر کے لئے ہم نے تصاویر کا خاص اہتمام کیا تھا۔ جرمنی کے بعض مشہور مصورین کی بنائی ہوئی چند نہایت مشہور تصویریں خاص کوشش سے براہ راست برلن سے حاصل کی تھیں بلاک بننے کے لئے آج کم و بیش دو مہینے ہوئے ایک نہایت مشہور کارخانہ کے پاس بھیج بھی دی گئیں۔ لیکن سخت تقاضا اور شدید انتظار کے باوجود اب تک وصول نہیں ہوئیں اور یہی سبب ہے کہ رسالہ غیر معمولی تعویق سے شائع ہو رہا ہے۔ بہت ممکن ہے یہ تصاویر آج کل میں آجائیں۔ بہرحال یقین نہیں ہے۔ آرزو یہ تھی کہ یہ نمبر خاص اہتمام کے ساتھ شائع ہوتا کہ ہمارے موجودہ خریدار ایک بار پھر دھوکا کھانے پر بخوشی آمادہ ہوں لیکن ؎

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں"تصویریں" ہمیں

بہرحال "سبق شوق مکرر" کے لئے ؎

میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں

جو حضرات سال بھر تک خریدار رہے خدا ان کی اور ان کی خریداری کی عمر دراز کرے۔ ہم آیندہ نمبر وی پی بھیجیں گے بہت ممکن ہے وہ سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں لیکن یہ

بھی ممکن ہے کہ اس کے باوجود بھی وی پی ان کے پاس چلا جائے۔ یہ ستم ظریفی ہو گی جس کی آرزو کوئی نہیں کرتا لیکن پسند شاید سب کرتے ہیں۔ ناظرین دعا کریں اور ہم کوشش کرتے ہیں کہ اس قسم کا حادثہ پیش نہ آئے۔ بہر حال ہماری تمنا ہے کہ ہمارے موجودہ خریدار آیندہ سال کے لئے بھی خریدار ہوں۔ روٹھے کو منانے کے ترتیب وار تین طریقے ہیں، خوشامد، ظرافت یا دھمکی، ہم نے اس کی ترتیب بدل دی ہے۔ دھمکی (بروزن وی پی) سے شروع کرتے ہیں، خوشامد پر ختم کرینگے یہ ترکیب ہم نے اپنے "اُستاد آخر" یورپ سے سیکھی ہے۔ اس لئے انجام سے مطمئن ہیں۔

شذرات کی کاپی دیکھ رہا تھا کہ متذکرہ صدر تصاویر میں سے دو تصویروں کا پارسل موصول ہوا۔ سجدۂ شکر بجا لایا ورنہ اندیشہ تھا "تعویق اشاعت" اور "دفع الوقتی" میں امتیاز کرنا ناظرین کرام کے لئے مشکل ہوتا۔ سہیل کے اجرا کے وقت ہم کو نہایت قوی امید تھی کہ ہم کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (علیگ) ام اے پی ایچ ڈی اور مولانا اقبال احمد خاں صاحب سہیل ام اے ال ال بی (علیگ) ہمارے دو فاضل اور مخلص

ترین دوستوں سے خاطر خواہ مدد ملے گی لیکن یہ ہماری اجتہادی غلطی تھی کیونکہ "مرشد" اور "مولانا" دونوں کو خلاف توقع عمل پیرا ہونے میں کمال تھا جس کو وہ اب بھی نبا ہتے ہیں۔ تصاویر کا انتظام تو "مرشد" نے کیا اور "ولادت حسین" "مولانا" کا عطیہ ہے۔ تصویریں تو کسی نہ کسی طرح آگئیں اور اب ناظرین کے سامنے ہیں۔ نظم بھی آج وصول ہوئی اور نہایت دقت کے ساتھ زیور طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔ ام سی سی کے سلسلہ میں ہر دو بزرگوار تشریف لائے تھے "خارجاً مسموع ہوا ہے" کہ یہ حضرات فوراً دونوں ٹیم کی کیپٹنوں سے ملے۔ اس کے بعد نہیں معلوم ہوا کہ کیا ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے ساتھ تماشائیوں کی صف بیں بادلِ ناخواستہ بیٹھے۔

ان تصاویر کی فراہمی اور تیاری میں ہم کو جو زیر باری ہوئی ہے اس کا اندازہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اس قسم کے کام سے آشنا رہ چکے ہیں بہت ممکن تھا کہ بجائے ان دو تصاویر کے ہم ایک درجن تصاویر پیش کرتے اور اخراجات کے اعتبار سے بھی فائدہ میں رہتے لیکن ہم کو یہ گوارا نہیں ہوا۔ اہلِ ذوق کی داد دوسروں کی سرزنش سے بہت زیادہ وقیع ہے۔

۵

سہیل کا یہ نمبر غیر معمولی توقف کے بعد شائع ہو رہا ہے لیکن اربابِ نظر کے نزدیک اس کا بالآخر شائع ہو جانا ہی اس تاخیر کی بہترین "جواب دہی" ہے ممکن ہے ہمارے بعض ناظرین اسے تسلیم کرنے میں تامل فرمائیں اس لئے ان کی تسکین و تشفی یا خدانخواستہ پیچ و تاب کے لئے ہم کو کچھ اور کہنا پڑ رہا ہے۔ اصل یوں ہے کہ اس تاخیر اشاعت کے اسباب اتنے ہی زیادہ اور (شاید) بے بنیاد ہیں جن کو ایک زبردست حکومت اعلانِ جنگ اور ایک کمزور قوم حصول سوراج کے لئے پیش کیا کرتی ہے۔ اس لئے یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ان کا تذکرہ تحصیل حاصل تاسف انگیز، خطرناک یا ہرسہ ہو گا۔ لیکن بعض جرائم کے متعلق اکثر دیکھا گیا ہے کہ "اجتناب" کبھی کبھی "ارتکاب" سے زیادہ سنگین

اور ناعاقبت اندیشانہ ہوتا ہے۔ مثلاً توہین عدالت' دفعہ ۳۰۴ یا خودکشی وغیرہ۔ اس لیئے ان تمام امور کو ملحوظ رکھکر جن سے متاثر یا مغلوب ہو کر ایک یا زاری انشا پرداز یا مقرر بے اختیار" عجب درویست اندر دل..... الخ یا گویم مشکل.... الخ وغیرہ قسم کی چیزیں لکھنے پڑھنے لگتا ہے اور ایک صحیح المذاق انسان کو اُسی بے اختیاری کے ساتھ بعض اس قسم کی حرکات کا مرتکب ہونا پڑتا ہے جن کا خیال کر کے وہ بعد میں خود منفعل ہوتا ہے' ہم کو بھی کچھ کہنا پڑتا ہے۔

اردو اخبار اور رسائل کے بروقت نہ نکلنے کا سبب اتنا ہی عام ہے جتنا نااہلوں کی خوش نصیبی! بہرحال سہیل کے چار نمبر تو کسی نہ کسی طور پر شائع ہو گئے۔ لیکن اب مالی دقتیں ایسی آن پڑی ہیں کہ کاربرآری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس وقت سے عہدہ برآ ہونے کے لیئے ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ بھی کر چکے انجمن کا دارالمطالعہ بند کر دیا گیا۔ تصویروں کی شق بھی نکال دی گئی استعفا بھی داخل کر دیا گیا۔ لیکن ایک پیش نہ گئی اس سلسلہ میں یزدان اور اہرمن دونوں کی بندگی کر لی۔ ہر جگہ مایوسی ہوئی کشو و کار کے یہ طریقے آئینی تھی اور آئینی طریقے فکر انسانی کی ٹھوکریں ہیں اس لیئے یزدان یا اہرمن سے رجوع کرنے کے بجائے

خود یزدان یا اہرمن بننے کا عزم کیا گیا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس کے لئے نتیجہ کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ طریقۂ کار نتیجہ کار بھی ہے؟

اس سلسلہ میں ذیل کا لطیفہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مینیجر صاحب پریس فرماتے ہیں:۔

سہیل کا پچھلا بل اب تک ادا نہیں ہوا جو اصولِ کاروبار کے بالکل منافی ہے۔ اگر آپ نے جلد سے جلد اس کا کوئی انتظام نہ کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی آئندہ طباعت و اشاعت ایک نامعلوم مدت تک معرض تعویق میں رہے گی جس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ عاقلاں را..... الخ

جناب وائس چانسلر صاحب بہادر بالقابہ کا ارشاد ہے:

"...... میں نے اسوقت نہایت فخر و مسرت کے ساتھ رسالہ سہیل دیکھا اور میں آپ کی علو صحافت و ندرت مضامین اور حسن انطباع پر آپ کو اور آپ کے شرکارِ کار کو بہ کمال ادب صدق دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔ میرا ناچیز ہدیۂ تبریک بکمال مہربانی اور فیاضی قبول فرمایا جائیگا۔ آخر میں آپ کی مزید کامیابی کی دعا کرتا ہوں" فقط والسلام

ہم کو اب تک اس کا اندازہ نہیں ہو سکا ہے کہ اس اشارہ اور ارشاد میں ہم کس سے جاں بر ہو سکیں گے۔ ممکن ہے خریداران اور ہمدردانِ سہیل اس کی کوئی سبیل نکال سکیں۔

ذیل کا مراسلہ ہم کو ہندوستانی اکیڈمی سے بغرض اشاعت موصول ہوا ہے:

"ہندوستانی اکیڈمی کے کونسل نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۲۷ء میں یہ طے کیا تھا کہ قبل اس کے کہ کوئی ادبی کام کیا جائے اُردو ہندی کے موجودہ لٹریچر کی حالت سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ دو کمیٹیاں ایک اُردو کے لئے اور دوسری ہندی کے لئے اس غرض سے مقرر کی گئیں کہ دو مہینے کے اندر ایگزیکٹیو کمیٹی کے سامنے ان لٹریچرس کی بابت رپورٹ پیش کریں۔ دونوں کمیٹیوں نے اپنی اپنی رپورٹیں بھیجیں اور ایگزیکٹیو کمیٹی نے ان رپورٹوں پر ۷ جولائی سنہ ۱۹۲۷ء کو غور کرتے ہوئے اکیڈمی کے حصول اغراض کے مناسب طریقوں پر بحث کی۔ ایک اسکیم سال رواں کے اخراجات کی تیار کی گئی جس کی رو سے پانچ ہزار روپیہ ان لوگوں کے لئے منظور کیا گیا جو جدید کتابیں

لکھیں۔ دو ہزار روپیہ ان لوگوں کے لئے جو سال رواں کے اندر بہترین کتاب تیار کریں۔ تین ہزار چھ سو روپیہ اُن لوگوں کی تنخواہ کے لئے جو دارالتالیف میں اکیڈمی کے جانب سے ملازم رکھے جائیں اور ایک ہزار روپیہ ان علماء اور فضلاء کے اخراجات کے لئے جن کو کہ اکیڈمی لکچر دینے کے لئے مدعو کرے کمیٹی نے یہ طے کیا کہ دو کتابیں ہندوستان کے ادبی تمدنی اخلاقی اور سیاسی حالت پر ایک ہندوؤں کے زمانہ کی دوسری مسلمانوں کے عہد کی تیار کرائی جائیں۔ ایک کمیٹی چند ممبروں کی اس غرض سے متعین کی گئی کہ وہ ایسے ادیب کا انتخاب کرے جو اس کام کے لائق ہو اور جب کتاب تیار ہو جائے تو اس کی طباعت کا بھی اہتمام کرے۔ دارالتصانیف کے مستقل ادیبوں کے تقرری کے واسطے اور لکچرر کے انتخاب کے واسطے بھی کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔

دو انعامات۔ ایک اس شخص کے لئے جو بہترین کتاب اردو نثر میں اور دوسرا اس شخص کے لئے جو بہترین کتاب اُردو نظم میں سنہ رواں میں تیار کرے۔ تجویز کئے گئے اور اسی طرح ہندی کے لئے بھی دو انعامات مقرر کئے گئے۔

عالی جناب[1] سر تیج بہادر سپرو پریسیڈنٹ اکیڈمی نے اپنی فیاضی سے ایک ہزار روپیہ اس غرض سے اکیڈمی کو عطا کیا کہ وہ اس فاضل کی خدمت میں بطور نذر کے پیش کرے جو ہندوستان کے اسلامی عہد کی معاشرتی اور تمدنی حالت پر تین خطبے پڑھے کمیٹی نے اس عطیہ کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور ایک ہزار روپیہ اپنے فنڈ سے اس لکچرر کو نذر دینے کے لئے علیحدہ تجویز کیا جو تین لکچر ان موضوعات پر جن کو اکیڈمی تجویز کرے گی تیار کرے۔

ہندوستانی اکیڈمی کا ابتدائی عملی دور بحیثیت مجموعی قابل ستائش ہے۔ اکیڈمی کے افتتاح کے موقع پر ہز اکسلینسی سر ولیم میرس بہادر گورنر صوبہ متحدہ نے اثنائے تقریر میں فرمایا تھا۔

"حقیقت یہ ہے کہ اول اول میں لفظ "اکاڈمی" کو سنکر چونکا تھا اور ہیں کیا ہر انگریز کے کان ضرور کھڑے ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس سے رشلو اور نپولین کی یاد تازہ

---

[1] خارجاً مسموع ہوا ہے" کہ ڈاکٹر محمد سلیمان صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد نے بھی اس قسم کی ایک رقم پیش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

ہو جاتی ہے۔ فرانسیسی اکاڈیمی قائم کرتے وقت اس کے بانیوں کے پیش نظر حسب ذیل مقاصد تھے:

سخت محنت اور کوشش سے زبان کے قواعد منضبط کئے جائیں۔ زبان سے بھرتی کے الفاظ دور کئے جائیں اور زبان کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھکر اس قابل بنایا جائے کہ علوم و فنون کی تالیف اور ان کے ترجموں میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ فرانس کے وہ ارباب علم جو اکاڈیمی کی کامیابی کے دعوے دار ہیں کہتے ہیں کہ اکاڈیمی نے فرانس کے مذاق ادب کی اصلاح کی اور اسی کا صدقہ ہے کہ آج فرانسیسی زبان میں یہ طرز ادا، خوبی بیان، سلاست اور نزاکت وغیرہ کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔"

جہاں تک فرنچ اکیڈمی کا تعلق ہے۔ بعض اہم نوعیتوں کا مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ فرنچ اکیڈمی کی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو اس میں کسی نہ کسی طور پر ایک حد تک قومی عنصر کی جھلک نمایاں تھی اس کی تعمیر و تخلیق فرانسیسی حکومت اور فرانسیسی قوم دونوں کے میلان و ارادہ کا مجموعہ تھی، نظر بر آں جہاں تک طرزِ ادا، خوبی بیان سلاست اور نزاکت یا زبان اور محاورہ وغیرہ کا تعلق تھا۔ اس کا فیصلہ مسکت اور قطعی ہوتا تھا اور لازماً قابل تسلیم تھا، اس کے

فیصلہ کو اس بنا پر تسلیم نہیں کیا جاتا تھا کہ اس میں قابل اور فاضل لوگ شریک کار تھے بلکہ اس میں قومی روح کا عنصر بھی شامل تھا۔ ہماری ہندوستانی اکیڈمی کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے اس کے وضع کئے ہوئے جملے یا فقرے یا مترادفات یا محاورہ اور زبان کی ترکیبیں قابلِ سند اور قابل قبول نہ ہوں گی۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اس میں قابل اور فاضل لوگ شریک کار نہیں ہیں بلکہ اس کو ایک حد تک نیم سرکاری حیثیت حاصل ہے اور اس کی سرکاری حیثیت قومی حیثیت سے بیگانہ ہے ہاں اس میں شک نہیں سرکاری سایۂ عاطفت شامل ہونے سے زبان کی مادّی ضروریات اور مادّی خوبیوں میں اضافہ ہو گیا ہے اور غیر قومی حکومت میں اتنی سی حیثیت بھی نہایت مفید ہوتی ہے۔ لٹریچر اور مفید لٹریچر کے حجم میں روز افزوں ترقی ہو گی۔ لیکن زبان کی جلا اور صفائی، سلاست اور نزاکت بڑی حد تک مفقود رہے گی۔ فرق کیفیت و کمیت کا ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی موخر الذکر حیثیت کو ترقی دینے میں معاون ہو سکتی ہے۔ لیکن اول الذکر نوعیت اس کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ لیکن مایوس یا آزردہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اردو اور ہندی دونوں کو ابھی حجم میں

ترقی کرنے کی شدید ضرورت ہے اور ہماری ذاتی رائے تو یہاں تک ہے کہ اب تک یہ اردو اور ہندی کی بدنصیبی رہی ہے کہ اس کے معاونین اور ہمدرد "کمیت" سے زیادہ "کیفیت" کی طرف مائل رہے۔

ہندوستانی اکیڈمی نے فی الحال جو کام ہاتھ میں لیا ہے اس کے مستحسن ہونے میں کلام نہیں اور جن اضافی لکچروں یا تقسیم انعامات کا اعلان کیا ہے وہ ہمدردانِ اُردو اور ہندی دونوں کے شکرگزاری کا موجب ہوگا۔ لیکن خیال ہے کہ اس سے بہتر طریقہ کار بھی ممکنات سے تھا، اس وقت سب سے زیادہ ضرورت، مصلحت اور مفاد دونوں اعتبار سے اس کی تھی کہ اردو اور ہندی انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تہذیب کا انتظام کیا جاتا۔ زبان اور ادب کو منظم، مرتب، وقیع پایندہ اور مفید بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس زبان کی انسائیکلوپیڈیا موجود ہو۔ یہ کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی اہتم بالشان ہے معمولی مجالس یا معمولی افراد سے اس کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے مستقل سرمایہ، مستقل کوشش اور آزمودہ کار افراد کی ضرورت ہے، حکومت کی سرپرستی ایک حد تک لازمی ہے اس قسم کے کاموں

ہیں حکومت کی مالی اور اخلاقی اعانت نہایت ضروری ہوتی ہے ہندوستانی اکیڈمی اس کے لئے موزوں ترین انجمن ہے۔ ہم اس مسئلہ کی جانب آنریبل وزیر تعلیمات سر میرو اور ڈاکٹر تاراچند صاحبان کی توجہ خاص مبذول کراتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آیندہ سال بجٹ کے موقع پر اس کا لحاظ فرمائینگے۔

ابھی ہم انسائیکلوپیڈیا کا خیالی پلاؤ ہی پکا رہے تھے کہ زندہ دلان پنجاب نے اپنے زندہ دلی کا ایک شاندار ثبوت بہم پہنچایا، سکرٹری بورڈ حفظ العلوم (وائٹ ہاوس انارکلی لاہور) کی طرف سے ایک نہایت مختصر اشتہار (بصورت رسالہ) شائع ہوا ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

حفظ العلوم کیا ہے؟

کروڑوں روپے کا علمی خزانہ' اُردو زبان کی سب سے پہلی ضخیم اور مکمل انسائیکلوپیڈیا جو پانچ پانچ سو صفحوں کی ۲۵۰ جلدوں میں ختم ہو گی۔ زبان نہایت سلیس اور شستہ اور سوا لاکھ تصاویر سے مزین جس میں فوٹو ہاف ٹون' زنک بلاک' وڈکٹ اور کئی ایک فل پلیٹ ہوں گی، بے شمار روپیہ بے دریغ

صرف کرکے دنیا بھر کے پچاس ہزار مرد اور عورتوں کے مضامین درج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے جو صرف مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتاب کو مستند اور شاندار بنانے کے لئے دنیا کے شہرہ آفاق ماہرین اور قابل پروفیسروں سے خاص خاص مضامین لکھوائے گئے ہیں نیز اعلیٰ درجہ کے مضامین نگاروں کی حوصلہ افزائی کی غرض سے دس ہزار (۱۰۰۰۰) نقرئی اور طلائی تمغوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ قبل از اشاعت حسب ذیل بورڈ اس دائرۃ المعارف/انسائیکلوپیڈیا پر نظر ثانی کرے گا۔"

اس کے بعد چالیس حضرات کا اسم گرامی درج ہے جن پر یہ بورڈ مشتمل ہے جسے بخوف طوالت یہاں ہم نظر انداز کرتے ہیں، آخر میں تفصیل مضامین ہے جسے ہم بجنسہ نقل کرتے ہیں:

۱۔ پونے چار لاکھ الفاظ کی تشریح و معانی

۲۔ اردو زبان کی تمام ضرب الامثال، محاوروں اور اصطلاحوں کی مفصل تشریح و معانی مع تاریخی واقعات وغیرہ

۳۔ تمام روئے زمین کے میلے، تیوہار، منڈیاں، رسم و رواج مع تاریخ متعلقہ

۴۔ علم ادب، علم تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، ہندسہ، حساب

اقلیدس، الجبرا، علم المثلث، جرثقیل، سائنس، انجنیری، حکمت، علم طب، علم جراحی، ویدک، کرانوپیتھی ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، علاج شمسی، علاج مائی، علاج ورزشی علاج برقی، علاج بے دوا، سلوتری، قیافہ، رمل نجوم، جفر، سامدریکھا، سرودھا، تعبیر خواب، علم الاسرار، اسپریچوے لزم، مسمریزم، ہپناٹزم، یوگ، علم الروح عملیات، کیمیا، ریمیا، ہیمیا، سیمیا، تفسیر، حدیث، علم فقہ، اصول، علم تصوف الٰہیات، فرائض، معانی، فلسفہ، مناظرہ، علم الکلام، علم البیان، صرف، نحو، عروض، قافیہ، علم بدیع، علم بلاغت وغیرہ علوم کے معنوں اور اصطلاحات کی تشریح۔

۵۔ مختلف علوم و فنون وصنعت وحرفت کے نسخے اور حالات مثلاً مصوری، نقاشی، پینٹری، فوٹوگرافی، رنگائی، چھپائی، کتابت، روغن سازی، وارنش سازی، دواسازی، عطاری، کشتہ سازی، مربہ سازی، اچار ڈالنا، چٹنیاں، حلوے اور مٹھائیاں بنانا، طباخی، جلا و آبداری، جلائے برقی جواہری، آئینہ سازی، گھڑی سازی، مشین سازی، فن لوہاری، سناری، نجاری، مصنوعی دھاتیں بنانا، گلٹ سازی

معماری، سیمنٹ سازی، موم بتی سازی، بافندگی، خیاطی کپڑے دھونا اور سینا، کھلونا سازی، کوزہ گری، سنگ تراشی، حکاکی، آتشبازی بنانا، دباغت، کشتی، تیراکی، بازی گری، دیاسلائی بنانا، زراعت و باغبانی، گھریلو پرندوں چرندوں، درندوں کی پرورش وغیرہ وغیرہ تمام فنون جو آج تک روئے زمین پر مروج ہیں۔ ان کی تازہ ترین ایجادات و معلومات۔

۶۔ مذاہب عالم کے عقائد و روایات، مت، متانتر، فرقے، دیوی، دیوتا، رشی، منی، راہب، کاہن، صوفی، پیغمبر، ولی، اوتار وغیرہ کے حالات۔

۷۔ دنیا کے مشہور مشاہیر مرد اور عورتیں مثلاً بادشاہ، حکمران، وزیر، امیر، رئیس، نواب، شاعر، عالم، فاضل، عامل، پہلوان تیرانداز، قدرانداز، بہادر، چور، ڈاکو، گٹھ کٹا، غنڈہ اہل ہنر، ملاح، تیراک، مصور، سیاح، عاشق، معشوق، مجنوں، حکیم، ڈاکٹر، وید، جوہری، سوداگر، شکاری، چابک سوار جادوگر، مداری، شعبدہ باز، رنڈی، عیاش، پیشوا، فقیر قانع، متوکل، عابد، زاہد، متقی، صابر، شاکر، ذاکر، غنی ریاضت کش، مجتہد، متکلم، ادیب، نحوی، طبیب، مہندس

نجومی، فلسفی وغیرہ لوگوں کے حالات اور تصاویر

۸- دنیا کی قوموں، فرقوں، ذاتوں، گوتوں، پیشوں اور ہنروں اور معاشرتوں کے حالات اور اصلیت۔

۹- موالید ثلاثہ یعنی حیوانات نباتات اور جمادات کا مفصل بیان مع تصاویر جن میں ہر ملک کے جانور، جڑی بوٹیاں، درخت اور معدنی پیداوار کا دلچسپ ذکر ہوگا۔

۱۰- مختلف دور کی اردو کے خانگی بازاری، درباری، مجلسی، سرکاری، علمی، ادبی، اخلاقی اور معاشرتی الفاظ محاورات واصطلاحات مع مطالب درج ہوں گے۔

۱۱- عربی، شامی، عربی۔ فارسی، تورانی، ترکی، ایرانی، فارسی، پشتو، کشمیری، پنجابی، سندھی، بنگالی، گجراتی، کنڑی، مرہٹی، تلنگو، اوڑیا، تامل، ملیالم، برج بھاشا، پراکرت، ہندی، سنسکرت، سوسینی، پوربی، میواڑی، بہاری، پالی، مرہٹی۔ دکنی، کوکنی، ماگدھی، مارواڑی، مہاراشٹری، انگریزی، لاطینی، ہسپانوی، روسی، فرانسیسی، جرمنی، پرتگالی، چینی، جاپانی اور دیگر اقالیم کے بہت سے جدید وقدیم الفاظ جو بحالت اصلی یا کسی قدر ردو بدل سے زبان اردو میں رائج رہے یا اب مستعمل ہیں

(جن احباب کو زبانوں کے رُوٹ یعنی اصل ماخذ معلوم کرنے کا شوق ہو ان کے لئے دفعات ۱۰ اور ۱۱ بڑی ہی مفید ہیں)

۱۲- تمام دنیا کی سلطنتوں کے تاج و نشان- ان کے حکمرانوں نوابوں، راجوں، اور سول ملٹری افسروں، رئیسوں، نائبوں بشپوں، لارڈوں اور دیگر مشاہیر عالم کے خاندانی، قومی اعزازی نشانات کی قدیم و جدید تصاویر مع حالات، دنیا کے سکوں کا ہندوستانی سکوں سے مقابلہ حکمرانوں کے سلامی اتواپ کی تعداد- اعلیٰ افسروں کی تنخواہیں اور بھتے وغیرہ وغیرہ

۱۳- قدیم و جدید آلات حرب و ضرب، ذرایع سفر یعنی مختلف ملکوں کی قدیم و جدید ریل اگنبوٹ، جہاز، ہوائی جہاز، کشتی گھوڑا گاڑی، بیل گاڑی، اونٹ گاڑی، چھکڑا، ڈولی پالکی جھپان، پینس، رکشا، مختلف جانوروں کی سواری، بوان، جھولا وغیرہ وغیرہ۔

۱۴- تمام دنیا کے شہروں، قصبوں، گاؤں کے نقشے جغرافیائی اور تاریخی حالات مع تازہ ترین مردم شماری،

۱۵- تمام روئے زمین کے ملکوں کی پیداوار سوغاتیں مع طریق

تجارت و دساور

۱۶- تمام دنیا کی تقریباً ۳ ہزار لڑائیوں اور مشہور واقعات عالم کے حالات مع مرقعہ جات، قدیم و جدید تصاویر۔

۱۷- دنیا کے عجائبات، طلسمات، حیرت انگیز حالات و معلومات قابل دید مقامات اور سیرگاہیں۔

۱۸- ہر ایک ملک کا خطِ تحریر اور بولی کا نمونہ قوانین عالم کا ضروری خلاصہ بسبیل اختصار۔

۱۹- لطائف، ظرائف، قصے، کہانیاں، افسانے، ناول، ڈرامے پہیلیاں، چیستاں، معمے، گورکھ دھندے تفریح و تفنن کی باتیں اور کھیل۔

۲۰- سکول، کالج، یونیورسٹی، جامع، دارالعلوم، لائبریری ریڈنگ روم، اخبارات اور مشہور و مستند کتب وغیرہ کا بیان

الغرض حفظ العلوم میں دنیا بھر کی ہمہ قسم کی معلومات درج ہوں گی۔ جس کے ہوتے ہوئے پھر کسی دوسری قاموس کی ضرورت نہیں رہے گی جس طرح انگریزوں کو انسائیکلوپیڈیا برطانیکا پر اور چینیوں کو چینی قاموس پر (جس کی کئی سو جلدیں ہیں) فخر و ناز ہے۔ ایسا ہی اردو کو **حفظ العلوم** پر ناز ہو گا۔ اور یہ نادرست و

بجا ہوگا۔ کیونکہ اُردو کی حمایت میں آج تک کوئی ایسی جامع قاموس اور مکمل اُردو انسائکوپیڈیا نہیں چھپی۔ لہٰذا علم دوست اصحاب سے گزارش ہے۔ کہ ہماری حوصلہ افزائی کے لیے اپنی اپنی معلومات میں قلمی امداد سے مدد فرما کر مشکور فرمائیں۔"

مفصل معلومات کے لحاظ سے یہ اشتہار بڑی حد تک نامکمل ہے یہ بھی ظاہر کرنا چاہیے تھا کہ کام شروع ہوا یا نہیں کس طور پر ہو رہا ہے۔ کہاں تک ہو چکا ہے اور کون کون حضرات مصروف کار ہیں، ہم ارباب حفظ العلوم کا تعارف کارکنان مرہٹی انسائیکلوپیڈیا سے کراتے ہیں۔

"سبکساران ساحلہا" کا "فغانِ نیم شبی" اس بحر ناپید اکنار میں کارکنان حفظ العلوم کے ساتھ ہے۔

ہمدردان اُردو اور بہی خواہان مسلم یونیورسٹی اس خبر کو مسرت کے ساتھ سنیں گے کہ حال ہی میں مجلس تعلیم نے اُردو میں ام اے جماعت کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب تک اسکول کالج اور یونیورسٹی میں اُردو کی تعلیم بطور ایک لازمی مضمون کے دی جاتی تھی جس کا سلسلہ بی اے تک ختم ہو جاتا تھا۔ طے یہ پایا ہے کہ ام اے کے علاوہ بی اے میں بھی اُردو کو بطور ایک اختیاری مضمون کے داخل کر لیا جائے، تمام امور متعلقہ

کو مدِ نظر رکھکر نصابِ تعلیم کی ترتیب و تدوین کے لئے مجلسِ تعلیم نے ایک کمیٹی مقرر کردی ہے جو مصروفِ کار ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۲۸ء سے اس کا نفاذ ہو جائے گا۔ ہم مجلسِ تعلیم کے شکر گزار ہیں اور ہمدردانِ اُردو کو ان کی دیرینہ آرزو بر آنے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ دینیات کا مسئلہ بھی اس وقت شعبہ دینیات اور مجلس تعلیم کے سامنے ہے بچلر آف تھیالوجی' ماسٹر آف تھیالوجی اور ڈاکٹر آف تھیالوجی کا نصاب بھی مکمل ہو چکا ہے۔ بچلر آف تھیالوجی کی جماعت غالباً ۱۹۲۸ء سے شروع ہو جائے گی اور اس کے بعد تدریج ماسٹر اور ڈاکٹر کی تعلیم کا آغاز ہو گا۔

۶

باز گو از نجد و از یارانِ نجد

وسط ۱۹۲۷ء میں سہیل کا چھٹا اور اس سلسلہ کا آخری نمبر شائع ہوا آج ۱۹۳۵ء کے آخر میں اس کو پھر منظر عام پر لانے کی توفیق ہوئی، پہلے یہ سہ ماہی تھا' اب سالانہ ہوگا اسی اعتبار سے بعض تبدیلیاں بھی نظر آئیں گی یقین ہے کہ یہ تبدیلیاں پسندیدہ بھی ہونگی اور مفید بھی۔

سہیل کا ماضی کچھ ایسا تاریک نہیں رہا ہے کہ اس کے لئے ہم شرمندہ ہوں اور نہ ایسا تابناک رہا ہے کہ اس کے سامنے دنیا کا ہر کارنامہ بے نور کیا جا سکے۔ ہمارے لئے یہ اکتفا کرتا ہے کہ ہم سے جو کچھ ہو سکا کرتے رہے جب کچھ نہ ہو سکا تو خاموش رہے اور

صورت حال امید افزا ہوئی تو جلد سے جلد پھر آمادۂ کار ہو گئے
ہم سے یہی ہو سکا اور ہو سکتا ہے اور یہ کوئی قابل سرزنش بات بھی نہیں
ہے۔ آئندہ سہیل دسمبر کے آخر میں شائع ہوا کریگا اس کی ظاہری صورت
دل کش نہ ہو تو یہ نہ ہمارا قصور ہے نہ سہیل کا مقصد، ہم حتی الوسع
اس کا لحاظ ضرور رکھیں گے کہ جو مضامین اس تک راہ پائیں وہ مفید
دلچسپ اور قابل قدر ہوں اردو میں بے شمار اور مختلف رسالے شائع
ہوتے ہیں اور ہم کو یقین ہے کہ ان سے ہر مذاق کی کسی نہ کسی حد تک
تشفی ہوتی رہتی ہے سہیل کے موجودہ نمبر میں بھی اس کا التزام ملحوظ
رکھا گیا ہے کہ مضامین میں تنوع ہو لیکن تنوع کا مفہوم یہ نہیں ہے
کہ معمولی یا ادنیٰ مذاق کی بھی تسکین ہو سکے۔ بحیثیت ایک دارالعلوم
کے ہمارا نصب العین یہ ہے کہ اردو کو ایسی ترقی پزیر سطح پر رکھا جائے
جو اردو اور اردو داں دونوں کے لئے صحیح اور صالح ہو۔ ہمارا
مقصد یہ نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اردو سمجھ سکیں بلکہ زیادہ
سے زیادہ لوگ فراست اولالعزمی اور ہمدردی کے ساتھ اردو
کی توسیع و ترقی میں حصہ لے سکیں۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے علی گڑھ کا کارنامہ یہی ہے کہ
اُس نے سمجھدار، ہمدرد، وسیع النظر اور وسیع المشرب ہستیوں کو ایک

مرکز پر مجتمع کیا، قابلیت کا معیار جغرافیائی نہیں بلکہ علمی و عالمانہ رکھا اس اعتبار سے جو لوگ علی گڑھ کے نام سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں وہ تنگ دلی اور ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہم کو ان سے عداوت نہیں ہے ہم ان کو حریف نہیں سمجھتے، ہم کو صرف ان کی تنگ خیالی پر ترس آتا ہے ان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ علی گڑھ کوئی محاذِ جنگ نہیں ہے بلکہ وہ صحیح اور صالح جذبات اور ذوقِ عمل کی دعوت دیتا ہے، ہم کو اس امر کا اعتراف ہے کہ علی گڑھ سے باہر کے لوگ بھی اردو کے ہمدرد ہیں، صاحب طرز ہیں، اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ ان کے خلوص، ان کی قابلیت، ان کی علو ہمتی میں کوئی شک نہیں۔ علی گڑھ ایک تصویر کی ترجمانی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ذی استعداد اور سمجھدار لوگ اس کی اعانت کریں اس کے لئے نہ اس کی ضرورت ہے کہ لوگ علی گڑھ میں آکر ملازمت کریں، نہ اسکی ضرورت ہے کہ اس کے نام پر بھلے مانسوں پر زندگی دوبھر کردیں، ضرورت صرف اس کی ہے کہ خود کام کریں، ہم کو کام کرنے دیں اور ایک دوسرے کے رفیق کار بنیں اور یہ بھی نہ ہوسکے تو کچھ نہ کریں۔ اکثر اس قسم کی مدد بھی بڑی قیمتی ہوتی ہے۔

(۸)

کچھ لوگ نہایت خلوص لیکن کسی قدر بے صبری کے ساتھ دریافت

کریں گے کہ علی گڑھ اس وقت کیا کر رہا ہے یہ سوال ضروری بھی ہے اور فطری بھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کرتے ہیں، خاموشی سے کرتے ہیں اور تحسین و تنقیص سے بے نیاز ہو کر کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک وقت کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے عام طور پر جب کبھی علی گڑھ کے سلسلہ میں کوئی بحث چھڑتی ہے تو ہمارے دوست غیر شعوری طور پر موجودہ علی گڑھ کا مقابلہ گزشتہ علی گڑھ سے کرنے لگتے ہیں اور ان حقائق کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں جو موجودہ اور گزشتہ علی گڑھ کو ایک دوسرے سے متمائز کرتے ہیں، بجا طور پر کرتے ہیں اور ناگزیر طور پر کرتے ہیں۔ ابتداءً علی گڑھ کا قیام اس ضرورت اور اس نیت کی بنا پر ہوا تھا کہ ایک ہول ناک ابتدا کو ہول ناک تر انجام سے بچایا جائے ۱۸۵۷ء میں وہ سب کچھ ہو گیا جو اپنے شدائد اور عواقب کے اعتبار سے اندلس، بغداد اور قسطنطنیہ کے زوال سے کسی حد تک سنگین تر تھا۔ مسلمانوں کی حکومت اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی دولت و امارت، ان کا تمدن، ان کی معاشرت ان کا علم و فضل غرض ان کی ساری متاعِ حیات تباہ ہو چکی تھی، بربادی کی یہ انتہا نہ تھی بلکہ اس کا انجام اس سے بھی زیادہ تاریک اور مایوس کن نظر آتا تھا، مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ اب صرف اس حکومت کے ہاتھ میں

نہ تھا جو اِن کے بجائے ہندوستان کے سیاہ و سپید کی مالک ہو چکی تھی بلکہ ان کا مقابلہ ہندوستان کی ان دیگر اقوام سے بھی تھا جو انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں سے بیزار تھیں۔

اس حالت میں سرسید سینہ سپر ہوئے۔ ہمارے نزدیک سرسید کا یہ کارنامہ فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ایسے وقت امداد کی جب بظاہر ان کا کوئی معین و مددگار نہ تھا۔ سرسید نے مسلمانوں کو ایک سے زیادہ غنیموں سے محفوظ رکھا جو اکثر اعتبار سے ظاہری دشمنوں سے زیادہ سفّاک اور بے پناہ تھے۔ عام طور پر جب کوئی قوم شکست کھاتی ہے تو اس کو صرف اپنے قریب ترین دشمن سے عہدہ برآ ہونے کی فکر ہوتی ہے اس کی اپنی ایک ہی جماعت ہوتی ہے جس کے اغراض و مقاصد قریب قریب یکساں ہوتے ہیں اُس کو متحد ہونے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ مثال میں جنگ عظیم کے بعد جرمن قوم کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ جس نے باوجود تباہی کے اپنے آپ کو جلد سے جلد منظم کرلیا لیکن مسلمانوں کی حالت بالکل جداگانہ تھی وہ اپنے ہی گھر میں دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے اور اب جو دنیا ان کے سامنے تھی اس میں تجارت کے نئے اصول سائنس کے جدید ترین انکشافات

تعلیم کے نئے نظریے، اخلاق و مذہب کے عجیب و غریب تصورات برسرِکار تھے مسلمانوں کو ان سب سے عہدہ برآ ہونا تھا اور ظاہر ہے کہ مادی اسباب اور وسائل کا فراہم کر لینا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا ذہنی انقلابات سے متوازن اور ہم آہنگ ہونا دشوار ہوتا ہے۔

ان تمام امور کو مدِنظر رکھکر اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سرسید نے علی گڑھ تحریک کی طرح ڈالی اب سرسید اور ان کے رفقا محسن الملک، وقار الملک، حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد چراغ علی نے مسلمانوں کے لئے حیاتِ نو کی بساط بچھائی ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ان غریبوں پر جو کچھ گزر گئی اس کا اعادہ یہاں یوں طوالت سے خالی نہ ہوگا اس پر مسلمانوں کی گزشتہ شصت سالہ تاریخ اور علی گڑھ کا ذرّہ ذرّہ گواہ ہے۔ ؎

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

چنانچہ مسلمانوں کے صلاح و فلاح کے سلسلہ میں جتنی تحریکیں اس زمانہ میں علی گڑھ سے اٹھائی گئیں وہ سب کم و بیش کامیاب ہوئیں تعلیم، مذہب، اخلاق، زبان، علوم، سیاست، تمدنی و معاشرتی

روایات غرض زندگی کے ہر شعبہ کے نشیب و فراز پر ہمارے قوم کی نظریں علی گڑھ کی سمت اُٹھتیں اور کامراں واپس ہوتیں۔

ہندوستان کی تاریخ نے نیا ورق الٹا۔ آئین سیاست نے بھی پہلو بدلا، جدید ترین علوم اور جدید ترین انکشافات نے زندگی کو یکسر منقلب کر دیا اور اخلاق، مذہب، تعلیم، حکومت صنعت و حرفت، تجارت اور سیاست نے اپنی اپنی جگہ پر مستقل حیثیت اختیار کی۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نئے نئے اصول وضع کئے گئے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا اور یہ عین فطرت تھا جس میں طنز و تمسخر یا زار نالی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ ان قوتوں یا ان مطالبات سے یکہ و تنہا عہدہ برآ ہونے سے علی گڑھ معذور رہا۔ انگلستان کے بارے میں یہ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ وہاں کی مشہور یونیورسٹیاں آکسفورڈ اور کیمبرج جن کے نام لیوا ہم بتائے جاتے ہیں، اخلاق مذہب صنعت و حرفت تجارت و سیاست وغیرہ وغیرہ میں وہاں کے باشندوں کی براہ راست خضر راہ بنی ہوں۔ اس سلسلہ میں اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں کی تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت، حکومت سب کچھ انگلستان ہی کی ہے اور انھیں کے لئے ہے!

آکسفورڈ، کیمبرج کو نظر انداز کیجئے، خود ہندو یونیورسٹی سے

کب ہند و قوم اس کا مطالبہ کرتی ہے۔ بات وہی ہے جس کا اس سے پہلے اعادہ کیا جا چکا ہے۔ یعنی ہم روایات کی پرستش کرتے ہیں اور حال سے اغماض کرتے ہیں۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ جہاں تک تعلیم اور تربیت ذہنی کا تعلق ہے ہم کو علی گڑھ پر نظر رکھنا چاہیئے لیکن اس کے علاوہ زندگی کے جتنے اور شعبے ہیں مثلاً صنعت و حرفت، تجارت، سیاست وغیرہ وغیرہ ان کے لئے مزید اور نئے نئے ادارے کھولنے چاہئیں اور انھیں سے مطلب برآری کی صورت نکالنی چاہیئے۔ ورنہ ہمیشہ خلطِ مبحث ہوتا رہے گا۔ اب علی گڑھ کو وہ مواقع حاصل نہیں ہیں اور نہ میسر آ سکتے ہیں جو عہد گزشتہ میں اس کو حاصل تھے اب ہم کو اور ہمارے نکتہ چینیوں کو تقسیم عمل کے اصول پر کاربند ہونا چاہیئے ورنہ ظاہر ہے یہ گتھی سلجھنے کے بجائے اُلجھتی ہی جائے گی۔

ہم اپنے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں سے التجا کرتے ہیں کہ وہ علی گڑھ پر غور کرنے سے پہلے ان مسائل پر بھی غور فرما لیا کریں علی گڑھ کے لئے نہایت آسان ہے کہ وہ صنعت و حرفت اور اس قبیل کے دوسرے شعبوں کو قائم کر کے ہر سال ایسے طلبا بھیجنا شروع کر دے جو ان علوم و فنون میں کامل

ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی کھپت کہاں ہو گی اور کیسے
ہو گی۔ اس سلسلہ میں ہندو یونیورسٹی کی مثال پیش کرنے سے
پہلے اس پر بھی غور کر لینا چاہیئے کہ ہندوستان کی حکومت میں
جہاں سے اس قسم کے کاروبار کے دروازے کھلتے بند ہوتے
رہتے ہیں مسلمانوں کا کہاں تک عمل دخل ہے یا خود مسلمانوں کے
کاروبار کتنے اور کیسے ہیں جو ہمارے نوجوانوں کو اپنی آغوش
میں لے سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہماری بیرونی جماعت
اس سلسلہ میں کیا کر رہی ہے۔ اس کو کیا کرنا چاہیئے اور
خود اس پر اس زبوں حالی کی ذمہ داری کہاں تک عائد
ہوتی ہے!!

یہ ایک اجمالی خاکہ تھا جسے ذہن میں رکھکر ہم کو علی گڑھ کی
صورت حال کا جائزہ لینا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں جیسا کہ پہلے
عرض کیا جا چکا ہے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ اس وقت
اردو کی خدمت کس طور پر کر رہا ہے۔ اس سوال کا جواب مختصر
طور پر دیا جا چکا ہے یعنی ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے ہم خاموشی
کے ساتھ کر رہے ہیں۔ پچھلے سال یونیورسٹی نے اردو میں ام اے
اور آنرز کی جماعتیں کھولدیں اور اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے

کہ یہ جماعتیں ابھی ابھی معرض وجود میں آئی ہیں یہ امر نہایت امید افزا ہے کہ طلبا کی تعداد سال بسال ترقی پذیر ہے۔

اس سال ہمارے دو ہونہار طلبا اپنے اپنے مخصوص مضامین کی ترتیب و تدوین کے لیئے ہندوستان کے مختلف حصص کا جہاں مفید مطلب مواد ملسکتا تھا دورہ کرتے رہے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے حیدرآباد کا بھی سفر کیا اور پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب کی ہدایات مہمان نوازی اور سرپرستی سے مستفید ہوکر واپس ہوئے۔ ابو لیث صاحب صدیقی جن کا مضمون انھیں صفحات میں نظر سے گزرے گا اُردو کے مختلف تذکروں پر کام کر رہے ہیں اور ان تمام تذکروں کو مد نظر رکھکر جو کسی نہ کسی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں اُردو کی ایک مختصر لیکن جامع تاریخ مرتب کرنا چاہتے ہیں یہ کام نہایت مفید اور اُردو کی تاریخ سمجھنے میں بڑی سہولت کا موجب ہوگا۔

لیث صاحب کو اس سلسلہ میں کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد اور بعض مشاہیر کے ذاتی کتب خانوں سے بعض نادر نسخے دستیاب ہوئے اور انھوں نے جستہ جستہ لیکن ضروری اقتباسات حاصل کر لیئے ہیں معین الدینصاحب دردائی اُردو مثنویوں پر کام کر رہے ہیں آئندہ اوراق میں ان کا ایک مضمون "بہار کی اردو شاعری"

پر نظر سے گزرے گا۔ معین صاحب نے اس مقالہ کی ترتیب میں نہایت تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے اور بڑی سعی کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ دورانِ تحقیقات میں ان کو بہار کے بعض خانقاہوں، درگاہوں اور شائقین علم کے ذاتی کتب خانوں میں اردو کے نہایت نادر اور کار آمد نسخے نظر آئے جن کو منظر عام پر لانا ضروری ہے۔ اس کام کو وہ کسی نہ کسی وقت ضرور شروع کریں گے۔ ہم کو امید ہے کہ ان کی یہ سعی مشکور ہو گی۔ ان تحقیقی کاموں کے علاوہ خلیل الرب صاحب صدیقی نے جناب اصغر کے جدید ترین کلام کے مجموعہ سرودِ زندگی پر تنقید کی ہے، علی سردار جعفری صاحب نے ایک ڈراما دیوانے پیش کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ سب مضامین لکھنے والوں کی آئندہ ترقی اور شہرت کا موجب ہوں گے۔ ہم کو اپنے ان تمام طلبا کی قابلیت اور محنت پر اعتماد ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ اردو ادب اور مادر درس گاہ کے چشم و چراغ ثابت ہونگے۔

(مکتوب)

سہیل کا مقصد اشتہار بازی نہیں ہے اسلیئے ہم نے اس کو تبرکات کا مجموعہ بنانے سے گریز کیا ہے۔ انجمن اردوئے معلیٰ اور سہیل ہماری درس گاہ کے طالب علموں کے رہین منت ہیں اور بڑی حد تک بعض طالب علموں کی مالی امداد پر اس کا قیام و بقا منحصر ہے۔ طالب علموں کے مضامین کو

کاملین فن کے معیار سے نہیں پرکھنا چاہیئے۔ طالب علم پھر طالب علم ہیں۔ ان میں کہیں لغزشیں نظر آئیں گی۔ ان لغزشوں کی اصلاح ہوتی رہی تو آخر میں یہی لوگ صاحبِ طرز اور صاحب فن ہو جائیں گے۔ نکتہ گیری کے بجائے ان کی ہمت افزائی کرنا چاہیئے۔ نوجوانوں کی بعض لغزشیں بوڑھوں کی اکثر شگافیوں سے زیادہ قابل احترام ہوتی ہیں۔

ہم مسرور اور مطمئن ہیں کہ علی گڑھ میں اب بھی وہ صلاحیت وہ جوہر، وہ ولولے اور وہ امکانات موجود ہیں جن کی تنظیم و تشکیل میں اردو کی اصلاح و فلاح مضمر ہے۔ آپ سہیل میں طلبا کے کافی مضامین مطالعہ فرمائیں گے ہمارا عقیدہ ہے کہ کوئی قوم اور اس کا ادب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس کے نوجوان اپنے جوشِ عمل اور جذبۂ خدمت سے دوسرے کام کرنے والوں کے معین نہ ہوں۔ سہیل میں آپ کو وہ توازن ملے گا جس کے بغیر کسی اہم کام کا تسلسل دکھانا ناممکن ہے۔ اس چیز کو نہ تو ایک نمبر سے دکھایا جا سکتا ہے اور نہ اسے اس طرح پر پرکھنا چاہیئے۔ اس کیلئے لازم ہے کہ خود کام میں تسلسل ہو۔ یہ کام سالہاسال کا ہے اور پھر بھی ختم ہونے والا نہیں ہے اور یہی اس کام کی اہمیت اور خوبی

کی ضمانت ہے ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک ست

ان مقالات کے علاوہ اس سال انجمن کی سرکردگی میں اردو کا ہفتہ منایا گیا جس میں طلبا اور اساتذہ نے اپنے اپنے مقالات پڑھے۔ یہ تقریب محض گرمیِ محفل کے سلسلہ میں نہ تھی، جو مقالات پڑھے گئے وہ اپنی اہمیت اور جامعیت کے اعتبار سے نہایت درجہ قابل قدر تھے۔ ہمارے طلبا میں یہ تقریب نہایت مقبول ہوئی اور باہر بھی قدر کی نظروں سے دیکھی گئی۔ اُردو اور انگریزی صحائف اور ہمدردانِ یونیورسٹی نے اس کی جس طور پر پذیرائی کی اس سے کارکنانِ تقریب کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ انجمن کے سامنے نہایت مفید پروگرام ہے، بعض مقالات اور دیگر کتب کی تدوین و طباعت کا کام بھی پیش نظر ہے لیکن۔ انجمن کے پاس مشکل سے اتنا سرمایہ ہے کہ وہ سہتیں کی طباعت و اشاعت کی کفیل ہو سکے۔ اس لئے بعض ضروری کام رُکے پڑے ہیں۔ یہاں بے موقع نہ ہوگا اگر ہم نہایت ادب اور خلوص کے ساتھ یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کی توجہ اُس تجویز کی طرف مائل کریں جس کا ذکر صدر انجمن نے

اُردو ہفتہ کے افتتاح کے موقع پر خطبۂ صدارت میں کیا ہے یعنی:۔

"علی گڑھ میں اُردو کا ایک دارالتصنیف ہونا چاہئے جس میں ہندوستان کے مختلف فضلا اور ہمارے منتخب فارغ التحصیل طلبا تصنیف و تحقیق میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم نوا رہ سکیں۔ ہم کو سرسید کی طرف اگر عود کرنا ہے تو سرسید کے اس زبردست کارنامے کو کیوں فراموش کیجئے۔ انھوں نے شعروادب کے مفسرین کو اپنے گردِ جمع کرلیا تھا اور یہ انھیں کا فیضان ہے کہ علی گڑھ میں اُردو کا نشاۃ الثانیہ طلوع ہوا اور علی گڑھ نے وہ سب کچھ کیا جس کے لئے اس کا نام روشن ہے"

اس تجویز کو معرضِ وجود میں لانا ازبس ضروری ہے طباعت واشاعت کا معقول انتظام نہ ہونے کے سبب سے یونیورسٹی کی علمی کارگزاریاں منظرعام پر نہیں آئیں۔ اس کے علاوہ نہ تو دوسروں کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور نہ اس قسم کے کام کی ترغیب و تحریص ہوتی ہے۔ اس کے لئے معقول اور مستقل سرمایہ کی ضرورت ہے لیکن نہ اتنے سرمایہ کی کہ ہم اس اہم تحریک کو نظرانداز کردیں یا قابلِ التفات نہ سمجھیں۔ خود ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کی کوئی تحریک قوم اور ملک کے سامنے پیش کی جائے تو ہماری توقعات

بڑی حد تک پوری ہونگی۔

ہندوستان کی قومی زبان کے مسئلہ پر انہیں صفحات میں ڈاکٹر اشرف صاحب کا مضمون خاص طور قابلِ توجہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فی نفسہ زبان کا مسئلہ اتنا پیچیدہ اور نازک نہیں ہے جتنا اسے مذہبی اور جماعتی رنگ دے کر ناخوشگوار اور ناپسندیدہ بنا دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی موجودہ بیداری صرف فرقہ وارانہ کشاکش اور باہمی نفاق اور بے اعتمادی کا ایک دردناک مظاہرہ ہے۔ جب یہ مسلم ہے کہ ہندوستان کی نجات اور آزادی اس پر نہیں منحصر ہے کہ ایک فرقہ کے علاوہ تمام دوسرے فرقوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیا جائے یا ان کو وجود معطل قرار دے دیا جائے تو پھر اس میں کیا قباحت ہے کہ ان کے جائز حقوق کو انصاف اور سیر چشمی سے نہیں تو مصلحتِ وقت کی بناء پر تسلیم کر لیا جائے لیکن اگر بے جا پاس داری اور ناروا سلوک سے مطلب برآری کی توقع کی جاتی ہے تو پھر بد دلی بے چینی افتراق و نفاق کا جو کچھ انجام ہوگا اس سے بھی رو گردانی نہ کرنا چاہیئے۔ خالص ہندو یا خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اس قسم کے مسائل کا تصفیہ ناممکن بھی ہے اور بڑی حد تک ناروا بھی۔ شرافت اور محبت کا

اقتضا تو یہ ہے کہ ہندوستان کی کس مپرسی اور درماندہ اقوام کی تالیف قلوب بھی مدِ نظر رہے لیکن اگر شرافت اور مروت کو ہندوستان کی سیاست سے خارج سمجھ لیا جائے اور رواداری کو بھی پسِ پشت ڈال دیا جائے پھر بھی یہ ناممکن ہے کہ صریح بے انصافی کو کبھی پابندگی نصیب ہو ہندوستان کی صلاح و فلاح میں مسلمانوں کا کچھ نہ کچھ حصّہ تو ضرور ہی رہا ہے۔ پھر ہندوستان کی انتظامی در و لبست میں مسلمانوں کی صلاح و فلاح کیوں نظرانداز کی جائے اور اس پر مسلمان آزردہ ہوں تو شکایت کا کیا محل ہے

اس کے علاوہ جب کوئی مسئلہ ہندوستانی یا قومی نقطۂ نظر سے پیش کیا جاتا ہے تو توقع بھی کی جاتی ہے کہ ہندوستان جن اقوام پر مشتمل ہے اُن سب کی صلاح و فلاح مدنظر ہو گی۔ قومی یا ہندوستانی کے معنی نہ تو "ویدک دھرم" ہے اور نہ "خلافت راشدہ" بصورتِ دیگر ویدک دھرم کے بجائے خلافتِ راشدہ کیوں نہیں یا دونوں کے بجائے "برطانیہ" یا "برطانیت" کیوں نہیں!

قومی زندگی کی نشو و نما اگر مذہبی یا جماعتی رنگ میں ہوئی تو ظاہر ہے کہ مذہبی اور جماعتی فساد کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں نمودار ہوتا رہے گا اور اس کی ذمہ داری ذمہ داروں کو کچھ اس طور پر بھگتنی پڑے گی کہ لوگ آشوبِ ہلاکو

اور فتنۂ چنگیز کو بھی بھول جائیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان درماندہ ہیں ان کو نہ اپنے آپ پر اعتماد ہے اور نہ اس نصب العین پر جس کے وہ علم بردار رہ چکے ہیں اور جس نے دنیا میں تمدن، اخوت، عافیت، جرأت، صداقت، شعر و ادب، علم و حکمت کو بلند، متوازن اور استوار کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب قوت بازو اور قوت ایمانی دونوں سے محروم ہیں۔ دوسرے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم اس بحث کو طوالت نہیں دینا چاہتے۔ مسئلہ زیر نظر صرف اردو ہے۔ اردو ہندی کے جھگڑے سے پہلے کسی کو کبھی اس کا احساس نہ ہوا کہ ہندوستان کے لئے ایک قومی زبان کی ضرورت ہے اور یہ محض اس بنا پر تھا کہ اردو عام طور پر سارے ہندوستان میں بولی یا سمجھی جاتی تھی۔ ہم کو یقین ہے کہ دنیا کے کسی حصہ ارض میں جو جغرافیائی تمدنی یا سیاسی اعتبار سے ہندوستان ہی کی مانند مختلف الحال اور مختلف النوع رہا ہو کوئی زبان اتنی کارآمد یا مقبول نہ تھی جتنا کہ ہندوستان میں اردو اور محض اس بنا پر کہ اردو کی حیثیت اس لسانی مفاہمہ کی تھی جو ہندوستان کی اقوام نے غیر شعوری طور پر بطیب خاطر بلا جبر و اکراہ یا ترغیب و تحریص کے خود بخود کر لیا تھا۔ اگر اردو کا وجود اس لئے

ناقابل برداشت ہے کہ اس سے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت یا ان کا تمدنی یا معاشرتی تسلط یاد آتا ہے تو پھر ان کو اُردو کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے وہ تمام ذہنی اور مادّی برکات بھی ہندوستان کی سرزمین اور ہندوستان کی تاریخ سے مٹانے کی کوشش کرنا چاہیئے جن سے ہندوستان نے فائدہ اُٹھایا ہے اور جن کی بنا پر یہی ابنائے وطن دنیا کے متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کے سامنے اپنی عظمت اپنے حقوق اور اپنی کارکردگی کی داستانیں دہراتے ہیں!

اسی ہندی تحریک کا ایک شاخسانہ وہ اضطراب و انتشار ہے جو بعض حلقوں میں سرحدی صوبہ میں اُردو کو ورنا کیولر قرار دینے کے سبب سے رونما ہے۔ ہندی کے علمبردار جس بیباکی سے ہندی کو جبریہ طور پر منوانے کی کوشش میں سرگرم اور آمادہ پیکار ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُردو جس مرنجان و مرنج طریق پر بے منت غیرے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے دلوں میں گھر کر رہی ہے۔ اس کو مٹا کر ہندی کی اشاعت کی جائے اور لوگوں کو ہندی سیکھنے اور بولنے پر مجبور کیا جائے۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ بھی اسی طور پر اور اسی ذہنیت کے ساتھ

ہندی کی تبلیغ اور اشاعت میں حصہ لے؟ ہمارے اس کہنے سے
معاً ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے گویا صوبہ سرحدی میں اُردو
کی اشاعت اسی طور پر کی جا رہی ہے لیکن صورتِ حال یہ نہیں
ہے۔ سرحدی اضلاع میں اُردو جتنی مقبول اور کار آمد ہے اس
سے کہیں زیادہ سرحدی صوبہ کے علاوہ ان تمام مقامات میں ہندی
اجنبی اور غیر کار آمد ہے جہاں ابنائے وطن اپنی دولت، طاقت
اور اقتدار کے بل پر ہندی نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ صوبہ سرحدی میں
اُردو کو مقبول ترین ورناکیولر قرار دینا عین انصاف اور عین ہمدردی
ہے۔ صوبہ سرحد اور آس پاس (دور دور تک) جو زبان مروج اور
مقبول ہے اُن سے سب سے زیادہ نزدیک اور سب سے زیادہ متجانس
اُردو ہے اور ہمارا خیال ہے کہ انتظامی مصالح کی بنا پر بھی حکومت
کو کسی ایسے فعل کا مرتکب نہ ہونا چاہیئے جو نسبتاً کم متمدن یا تعلیم
یافتہ قوم یا قبیلہ کے اشتعال پذیر جذبات کو اکسانے کا محرک
ہو۔ زبان کے مسئلہ میں حکومت کا یہ رویہ ہمدردانہ منصفانہ اور
ان سب سے بڑھکر دانشمندانہ بھی ہے۔ ہندی کو جبری طور پر
صوبہ سرحد میں نافذ کرانے میں بہت سے خطرات پوشیدہ ہیں
ان قبائل میں غلط فہمی یا بدگمانی کا پیدا ہونا، ہندو مسلمان انگریز
سکھ کسی کے حق میں مفید نہ ہوگا۔

سیاسی، معاشرتی اور تمدنی اعتبار سے جو اہمیت اور قبول عام اردو کو نصیب ہے اس کا تذکرہ سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔ اب ہم نہایت اختصار لیکن وثوق کے ساتھ اردو کی لسانی حیثیت کو پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ارباب نظر پر یہ امر بھی روشن ہو جائے کہ اردو قطعاً وہ زبان نہیں ہے جس کو ہندوستان میں کسی اعتبار سے اجنبی کہا جا سکے۔ نظر براں اردو کو بدیسی کہنا زبان کی تاریخ، ترکیب اور فلسفہ سے بیگانگی کی دلیل ہے۔

حسب ذیل بحث پروفیسر سید وحید الدین سلیم مرحوم کی معرکتہ الآرا کتاب وضع اصطلاحات سے ماخوذ ہے جسے انجمن ترقی اردو نے اورنگ آباد (دکن) سے شائع کیا تھا

ماہرین لسانیات نے السنۂ عالم کی تقسیم یوں کی ہے:۔

۱۔ آریائی ۲۔ سامی ۳۔ تورانی

آریائی زبان دو شاخوں میں منقسم ہے:۔

(۱) مشرقی (۲) مغربی

مشرقی شاخ چار شعبوں میں تقسیم ہے:۔

(۱) ہندی ایرانی (۲) اناطولک

(۳) تھرسی الیری (۴) بالطوسلوکی

ہندی ایرانی: ۱۔ ہندیائی اور ۲۔ ایرانیائی شعبوں میں منقسم ہے

ہندیائی دو بڑے مجموعوں پر مشتمل ہے یعنی :
(۱) سنسکرت اور (۲) غیر سنسکرتی

سنسکرتی زبانوں کے زمرہ میں ؛ سنسکرت ، پالی ، مہاراشٹری ، ماگدھی ، سورسینی ، کشمیری ، سندھی ، مرہٹی ، اُڑیا ، بنگالی ، آسامی ، راجستانی ، گجراتی ، نیپالی ، سنگھالی ، ہندی بھاشا اور اُردو کا شمار ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو ان زبانوں میں شامل ہے جو سنسکرت سے مشتق ہیں۔

دوسری طرف ایرانیائی شعبہ میں پشتو ، فارسی ژند اور پہلوی زبانیں شامل ہیں
نتیجہ یہ نکلا کہ اردو کا رشتہ فارسی اور اس کی شاخوں سے بھی ہے۔

عربی کا تعلق سامی خاندان سے ہے اور ترکی کا تورانی سے
اُردو میں عربی زبان کے الفاظ مشتقات ترکیب یا قواعد کی کارفرمائی جس حد تک ہے اس سے کم وبیش ہم سب واقف ہیں اس لیئے اس کا تذکرہ طوالت سے خالی نہیں

ترکی زبان کا رشتہ تورانی سے ملتا ہے۔ اردو میں ترکی الفاظ کا بھی کافی ذخیرہ ہے۔

اس طور پر اُردو کا تعلق دنیا کے تینوں مشہور خاندانہائے السنہ سے ہوا۔

لیکن چونکہ اُردو زبان کی ترکیب اور اس کی گرامر وہی ہے جو آریائی خاندان کے زبانوں کی ہے اس لئے اس کو آریائی ہی زبانوں کے خاندان میں شامل کیا گیا ہے اور دوسرے دو خاندانوں (سامی اور تورانی) کو نظر انداز کر دیا گیا ہے گو عربی جس حد تک اُردو میں دخیل ہے اس کو نظر انداز کرنا ناانصافی بھی ہے۔

آریائی زبانوں کا پہلا مشترک اصول یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ پاس پاس رکھ دیئے جائیں جس کو ہم مرکب امتزاجی بھی کہہ سکتے ہیں مثلاً انگریزی میں ہارس ریس۔ پوسٹ مین جابلون ہیں۔ اُردو میں اس کی چند مثالیں یہ ہیں: اکاس دیا۔ جیب گھڑی، خانہ داماد، زن مرید۔

آریائی زبانوں کا دوسرا مشترک اصول یہ ہے کہ الفاظ تو پاس پاس رکھے جائیں۔ لیکن ان کے درمیان قواعد کے اعتبار سے ربط ہو اسے مرکب ارتباطی کہتے ہیں مثلاً بک پاکٹ، پاس ٹائم، برک واٹر، انجن ڈرائیور اردو میں اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

چڑیمار، منھ توڑ، مکھی چوس، چلتا پرزہ۔

گو اس میں شک نہیں کہ مرکبات امتزاجی میں مرکبات اضافی اور مرکب ارتباطی مرکبات توصیفی اور بعض فعلی مشتقات کے سوا کچھ اور نہیں۔

تیسرا اصول جو آریائی زبانوں میں مشترک اور یکساں طور پر پایا جاتا ہے یہ ہے کہ لفظ کے شروع یا آخر میں ایک جزو بڑھا دیا جائے جس کو اصطلاح قواعد میں پریفکیس (سابقہ) اور سفکس (لاحقہ) کہتے ہیں۔ آریائی زبانوں میں سنسکرت کے علاوہ یونانی، لاطینی، اطالوی، فرانسیسی، اندلسی، آسٹروی اور پرتگالی بھی شامل ہیں۔ سابقہ اور لاحقہ کی کارفرمائی اردو میں بھی مسلم ہے۔ جہاں یہ بیشتر فارسی، ہندی کہیں کہیں عربی سے اور ایک جگہ ترکی سے لئے گئے ہیں۔ اس سے اردو کی ہمہ گیری اور ہمہ پذیری ثابت ہوتی ہے۔

چوتھا اصول آریائی زبانوں میں یہ ہے کہ حسب ضرورت ہر لفظ سے فعل بنا لیا جائے۔ اس کی مثالیں اردو میں کثرت سے ملیں گی۔ اس کے بعد اردو مصادر کی بحث آتی ہے جن میں ایک تو وہ ہیں جو آواز سے بنائے گئے ہیں مثلاً: بڑبڑانا، بھنبھنانا اور دوسرے وہ جو عام الفاظ سے بنائے گئے ہیں مثلاً: بخشنا، برمانا، رنگنا۔ ان ہر دو اقسام کے سلسلہ میں اور بہت سی مثالیں

پیش کی جا سکتی ہیں جن کو بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ فارسی بھی آریائی زبان ہے' وہاں بھی بالکل اسی طرح فارسی یا عربی زبان سے الفاظ لے کر مصادر بنائے گئے ہیں مثلاً: آگاہ سے آگاہیدن ۔ رقص سے رقصیدن وغیرہ ۔

مذکورہ بالا چار اصول آریائی زبانوں میں عام طور پر کارفرما ہیں جن میں سے پہلے تین اصول سامی خاندانوں کی زبانوں میں نہیں ملتے ۔ چوتھا اصول البتہ عربی زبان میں بھی پایا جاتا ہے مگر مصادر کے خاص اوزان مقرر ہیں جن کی پیروی کئے بغیر یہ اصول عربی زبان میں دخیل نہیں ہو سکتا ۔

اس سلسلہ میں بے محل نہ ہو گا اگر ہم یہاں اردو زبان میں آریائی اور سامی عناصر کے تناسب کا بھی جائزہ لے لیں ۔

پروفیسر سلیم مرحوم نے سید احمد دہلوی کے مشہور لغت فرہنگ آصفیہ کے حوالہ سے مختلف زبانوں کے الفاظ کی حسب ذیل جدول پیش کی ہے :۔

فرہنگ آصفیہ میں مجموعی الفاظ کی تعداد ۵۴۰۰۹ ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

۱۔ ہندی جس کے ساتھ پنجابی اور پوربی زبان کے بعض خلص الفاظ بھی شامل ہیں ۲۱۶۴۴

۲۔ اُردو یعنی وہ الفاظ جو غیر زبانوں سے ہندی کیساتھ ملکر بنے ہیں	۵۰۵
۳۔ عربی	۵۸۴
۴۔ فارسی	۶۰۴۱
۵۔ سنسکرت	۵۵۴
۶۔ انگریزی	۵۰۰
۷۔ مختلف	۱۸۱

میزان کل ۵۴۰۰۹

یہ تفصیل ہر قسم کے شکوک کا نہایت آسانی کے ساتھ ازالہ کرسکتی ہے اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ اُردو ہندی نژاد نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر آریائی زبان نہیں ہے اور ہندوستان کی مشترک زبان بننے کی حقدار نہیں ہے یا اہلیت نہیں رکھتی لاعلمی اور ناانصافی ہے۔

———— (۞) ————

اعلحضرت خسرو دکن نے دارالعلوم علی گڑھ کے منصب چانسلری کو شرف قبول عطا فرماکر ہمارے قلوب کو جن جن جذبات تشکر و عقیدت سے مملو فرمایا ہے اس کا اندازہ احاطۂ بیان سے باہر بھی ہے اور بے نیاز بھی سلطان العلوم کی اس دانش پژوہی و علم پروری پر ابنائے ملک و ملت مسرور و مطمئن

ور مفتخر ہیں۔ جس طرح اس دارالعلوم کی فیض رسانی جغرافیائی حدود سے آزاد اور نسل و جماعت کے تصور سے بے نیاز رہی ہے اسی طرح شہر یارِ دکن کی بے دریغ بخشش بھی عام اور عالمگیر رہی ہے۔ اس نسبت سے شہر یار دکن کے سایۂ عاطفت کی ہمہ گیری اور ہمہ نوازی مبرہن اور متیقن ہے۔ اس دارالعلوم کو ایسے ہی سلطان العلوم کی تمنا تھی جو پوری ہوئی۔ الحمد للہ

ابتدائے قیام ہی سے اس درس گاہ کی آبیاری اس چشمۂ فیض سے ہوتی رہی ہے اور علی گڑھ کی ترقی، منزلت اور کامرانی میں دکن نے جس جس پہلو سے اور جن جن مواقع پر دستِ کرم بڑھایا ہے اس کی تفصیل کا دوسرا موقع آئے گا۔ یہاں ہم صرف ؎

درودے می تواں گفتن، سجودے می تواں کردن

پر اکتفا کرتے ہیں۔

سلطان العلوم کی ۲۵ سالہ جشن جوبلی کی تقریب میں اہالیان یونیورسٹی کا ایک وفد آستانۂ دولت پر حاضر ہو کر نذرِ عقیدت پیش کرے گا۔ ہم اس موقع پر انجمن اردوئے معلی کی طرف سے اردو کے سب سے بڑے محسن کی خدمت میں اپنی عقیدت، خیر سگالی اور دعائے جاہ و منزلت کا ہدیۂ محقر

پیش کرتے ہیں۔

اکتوبر کی آخری تاریخوں میں خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم کی ولادت کی صد سالہ برسی پانی پت میں منائی گئی اس مہتم بالشان ادبی و تاریخی جشن کی صدارت مادر کالج کے مشہور و مقتدر فرزند اور یونیورسٹی کے سابق چانسلر ہز ہائینس والی بھوپال نے فرمائی، ہندوستان کے بہت سے ممتاز ادیب شعرا، مشاہیر، معلّم اور حکومت کے سربرآوردہ اراکین شریک تھے۔ جلسہ کی کارروائی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی حالی اسکول کے بچّوں نے نہایت موثر انداز اور لہجہ میں مسدس کے چند بند سنائے۔ اس کے بعد علامہ سر اقبال کی ایک مختصر نظم جو اسی موقع کے لئے تصنیف ہوئی تھی اور سہیل کے آئندہ صفحات میں نظر آئے گی پڑھی گئی۔ جس میں شاعر نے نہایت وقار متانت اور عقیدت کے ساتھ حالی کی عظمت کا اعتراف اور والی بھوپال کی بلند پایہ شخصیت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد مشاہیر شعر و ادب نے نہایت جامع اور پُر مغز مقالے پڑھے جن میں سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا مقالہ حالی بحیثیت محب وطن سہیل کے انھیں صفحات میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ پسند کیا جائیگا۔

حکمرانِ بھوپال نے اس مبارک موقع پر حالی ہائی اسکول اور بچیوں کی تعلیم کے لئے بیس ہزار روپئے عطا فرمائے، علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبا نے ایک ہزار کی رقم پیش کی۔ حکام دربار بھوپال نے ایک ہزار روپئے، نواب صدر یار جنگ بہادر نے پانسو۵ اور دیگر اصحاب نے نہایت کشادہ جبینی کے ساتھ مالی امداد فرمائی۔ اس موقع پر حالی پبلشنگ ہاوس نے مسدس حالی کا جدید اڈیشن شائع کیا جو اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اس جشن کے انعقاد سے پہلے اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لئے علی گڑھ کے طلبا اور اساتذہ نے جس ولولۂ ہمدردی اور عقیدت کا ثبوت دیا اس سے ہم بے انتہا متاثر، مسرور اور مطمئن ہیں۔ کار پردازانِ تقریب نے مہمانوں کی پزیرائی، قیام و طعام اور راحت رسانی کے انتظامات جس عالی شان پیمانہ پر کئے تھے اور جس خیر و خوبی کے ساتھ وہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوے وہ بجائے خود ان کی عقیدت اور ان کے ولولۂ خدمت کا بہترین نمونہ تھا۔

یہ مختصر روداد تھی حالی سنٹنری کی جن سے ناظرین کم و بیش واقف ہوں گے۔ یہاں ہم اُن میلانات ذہنی اور ہوا کے رُخ پر بھی کچھ اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں جس کے بغیر اس

جشن کی شان نزول اور حسن خاتمہ کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

غدر کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی کو جس نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محسوس کیا وہ حالی تھے لیکن حالی ان لوگوں میں نہ تھے جن کی آواز بھی سب سے پہلے سنی اور سمجھی جاتی ہے بایں ہمہ اس آواز کے صحیح اور موثر ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسی آواز کی بازگشت آخر تک قائم رہتی ہے اور اس سے پہلے جتنی اور آوازیں بلند ہو چکی ہوتی ہیں وہ سب یا تو ختم ہو جاتی ہیں یا ان میں تاثیر نہیں باقی رہتی۔

حالی مسلمان تھے اور مسلمانوں کی درماندگی کے مفسر ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ہم اس سے انکار کر کے حالی کی روح کی توہین نہیں کرنا چاہتے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی مسلمان نہ بھی ہوتے تو بھی وہ مسلمانوں کی فلاکت و ہلاکت پر اسی انسانی ہمدردی اور اسی قوتِ ایمانی کے ساتھ خون کے آنسو روتے اور دعوتِ عمل دیتے جو ان کی زندگی کا امتیاز خصوصی تھا۔ ان کا حلم، ان کی تواضع، ان کا اخلاق، ان کی ہمدردی، ان کی انسانیت، اپنی اپنی جگہ نرمی، لینت اور عطوفت کی مکمل تشبیہ تھی۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ اس طلب، اس ولولہ، اس بیداری اور پیش قدمی کا مظاہرہ تھا جو اکثر اپنی عریانیوں

کے ساتھ نمودار نہیں ہوتا بلکہ اپنے ردِ عمل کے ماتحت دگرگوں ہوکر دنیا اور دنیا والوں کے سامنے آتا ہے اور یہی سبب ہے کہ حالی کی بردباری اور ان کی مسکنت اُن تمام طوفان زائیوں پر فوق تھی جن سے ان کو سابقہ تھا۔ پیغمبر اور فاتح میں یہی فرق ہے، اور اسی فرق کو پاکر اور پہچان کر وہ لوگ آمادہ پیکار ہوئے جو مذہب یا خدا کو حقیقت نہیں بلکہ روایت سمجھتے آئے ہیں

تعجب کرتے کرتے ہم کو بے اختیار ہنسی آئی جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ والیٔ بھوپال کا مقاطعہ اس لئے کرنا چاہیئے کہ انھوں نے جشنِ حالی کا صدر ہونا منظور فرمایا۔ تنگدلی اور تنگ ظرفی کا یہ وہ مظاہرہ تھا جس کی مثال نہ آنکھوں نے دیکھی اور نہ کانوں سے سُنی۔ جشنِ حالی کا پروگرام عام ہوچکا تھا اس میں ہم نے کوئی بات ایسی نہ دیکھی جس کو ہندوستان کی صلاح و مفاد کے لئے مضر سمجھ سکتے، والی بھوپال کی سیر چشمی اور روشن خیالی رواداری اور حریت فکر کے ہم قائل ہوں یا نہ ہوں اڈیٹر لیڈر اس کے معترف ہیں، پھر اس مخالفت کو کس چیز پر محمول کیا جائے؟ ممکن ہے پانی پت کے میدان میں تاریخ ہند کے کچھ ایسے اوراق منتشر ملے ہوں جن کا مطالعہ مشاہدہ کے حدود تک پہنچا ہو اور مشاہدہ نے دماغی توازن دگرگوں کر دیا ہو۔ لیکن ہم اپنے

دوستوں کو یقین دلاتے ہیں کہ ہز ہائی نس نے پانی پت کے میدان میں اسی نیت اور ولولہ کے ساتھ قدم رکھا تھا جس سے وہ کرکٹ کے میدان میں قدم رکھنے کے عادی تھے اور اسی مسرت اور اطمینان کے ساتھ واپس ہوئے جس مسرت و اطمینان کے ساتھ وہ کرکٹ فیلڈ کو چھوڑتے تھے۔

راقم السطور اس جشن کے موقع پر موجود تھا۔ اس کے مناظر اس کی فضا اور اس کی کیفیت اب بھی ذہن و دماغ پر منقش ہے۔ خواجہ سجاد حسین صاحب کی بزرگی، ان کا بڑھاپا، آواز میں رقت ہاتھوں میں رعشہ، قویٰ میں اضمحلال، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے میں ماندگی۔ کبھی یہ بھی معلوم ہوتا کہ علیین سے خود حالی ہماری فتادگی پر ہمیں تسکین دینے آئے ہیں کبھی یہ محسوس ہوتا کہ خود خواجہ صاحب ہماری کمزوری، ہماری بے حسی اور ہماری بے بسی کا پیام لے کر حالی کے ہاں جانے والے ہیں، دوسری طرف ہز ہائی نس پر نظر پڑتی تو قلب و دماغ پر ایک دوسری کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ہز ہائی نس صدارت کی کرسی پر نہایت وقار، حلم اور اعتماد کے ساتھ متمکن تھے۔ وجاہت، ذہانت، مستعدی، نفاست، سادگی اور شگفتگی کے پہلو بہ پہلو ایک طرح کا رکھ رکھاؤ بھی تھا۔ بحیثیت صدر کے ممدوح نے جو کچھ فرمایا اس میں ایک نوجوان کا تصور

وتخیل، آزمودہ کار کی سنجیدگی وپختگی اور سرخیل کا عزم و اعتماد پایا جاتا تھا۔ جلسہ کی ساری فضا میں ایک خاص قسم کا نظم، ترفع اور مخصوص انداز کی رجائیت جاری وساری تھی جس میں ہز ہائی نس کی موجودگی اور ان کا منصب اس درجہ موزوں اور مناسب حال تھا کہ کسی قسم کی کہیں کمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ توفیق انسانی اور تائید الٰہی کا یہ منظر و مظہر امید ہے ہمارے دلوں کو تادیر گرماتا رہے گا۔

حالی! سلام ورحمت، تیرا خلوص برگزیدہ تھا، تیری دعائیں مقبول ہوکر رہیں گی۔ آمین۔

حالی کی اس یادگار کو مزید تقویت پہنچانے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مختلف مشاہیر شعر و ادب اور پیشوایانِ ملک و ملت سے درخواست کی جائے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے اپنے زرّین خیالات سپردِ قلم فرمائیں۔ اس طور پر نہایت گراں قدر مقالات کا ایک مجموعہ نذرِ حالی یا کسی اور نام سے شائع ہوسکیگا ہندوستان بالخصوص اردو میں ممکن ہے یہ چیز نئی ہو۔ لیکن ہندوستان سے باہر اس قسم کی مطبوعات اور یہ نذرِ عقیدت نہایت عام اور مقبول ہے ہم پروفیسر خواجہ غلام السیدین صاحب

کی توجہ خاص طور پر اس جانب منعطف کرانا چاہتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہماری اس تجویز کو مزید تقویت حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے پہنچے گی۔ انشاءاللہ

مولٰنا ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کو ایک نادر قلمی کتاب ہماری یونیورسٹی کے قلمی کتب کے ذخیرہ میں دستیاب ہوئی ہے جس کا نام ہشت گنشت ہے پورے دوسو صفحات پر محیط ہے تقطیع ۹ × ۵½ کاغذ دیسی بانس کا۔ ہر صفحہ پر بارہ سطریں ہیں اور بعض پہ تیرہ بھی۔ خط معمولی لیکن خواندہ ہے۔

کلکتہ میں مسٹر ویلیم بیم مارٹن کی فرمائش سے منشی غلام احمد دہلوی نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔ شروع کتاب میں مترجم نے اپنے مختصر حالات لکھنے کے بعد یہ لکھا ہے۔

"حضرت امیر خسرو کی کتاب ہشت بہشت کے قصہ بہرام گور کو میر حسین شاہ متخلص بہ حقیقت نے فارسی نثر میں لکھا تھا۔ مسٹر ویلیم بیم مارٹن صاحب کی فرمائش سے میں نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس کتاب کا تاریخی نام باغ و بہار ہے جس سے ۱۲۱۷ء افضلی نکلتا ہے۔

یہ نسخہ سنہ ۱۲۱۹ فصلی مطابق سنہ ۱۲۷۰ھ کا لکھا ہوا ہے یعنی سنہ تصنیف سے صرف دو سال بعد لکھا گیا۔ کاتب کا نام درج نہیں ہے۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے ابھی یہ کتاب شائع نہیں ہوئی ہے اگرچہ اس زمانہ کی اکثر کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں مزید اور مکمل تر تحقیقات کے بعد حالات مساعد ہوئے تو مولانا ممدوح اس کتاب کو طبع کرانے کی کوشش فرمائیں گے۔

ہماری یونیورسٹی کے اساتذہ کی حسب ذیل کتب شائع ہوئیں۔

۱۔ اصول تعلیم	از	پروفیسر خواجہ غلام السیدین
۲۔ شہیدانِ وفا کا خوں بہا کیا	از	" "
۳۔ طنزیات و مضحکات	از	رشید احمد صدیقی
۴۔ دیوانِ مومن	از	مولانا ضیاء احمد صاحب ام اے
۵۔ سلسبیل (مجموعہ کلام آل احمد سرور صاحب)	از	آل احمد سرور صدیقی ام اے

سہیل کے بعض مضامین کا اس سے پہلے ذکر آچکا ہے بعض دیگر مضامین کے بارہ میں جستہ جستہ ضروری اشارات یہاں کر دینا ضروری ہے۔

مصوری کے میلاناتِ نو پر ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب (علیگ) کا مضمون یوں قابلِ توجہ ہے کہ صاحب مقالہ کو فنونِ لطیفہ بالخصوص مصوری سے خاص لگاؤ ہے اور وہ مشرق و مغرب کے جدید رجحانات سے پورے طور پر باخبر ہیں عام طور پر اس قسم کے مضامین کے تراجم ہوتے ہیں اور ہم کو یہ معلوم کرنے میں دشواری پیش آئی ہے کہ خود ہمارے ہاں کے اصول و اسلوب فن پر ان کو کیونکر اور کہاں تک تطبیق دیا جاسکتا ہے یا مختلف ممالک کے میلانات میں کہاں کہاں اور کس حد تک توافق یا تصادم ہے۔ اس مضمون میں سلیم صاحب نے ہماری دشواریوں یا کوتاہیوں کو مدنظر رکھکر ہم کو فن اور صاحبانِ فن سے روشناس کیا ہے اور کامیاب ہوئے ہیں۔

تصاویر کی فرہنگ دینے سے گریز کیا گیا ہے' البتہ جن مصوروں کے موقلم کے یہ نتائج ہیں ان کا جستہ جستہ تذکرہ کردیا گیا ہے۔ تصاویر کے سمجھنے سے پہلے مصور کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ نمونہ کے طور پر جو تصاویر سہیل میں شامل ہیں ان کا انتخاب ذوقِ نظر کے ماتحت نہیں کیا گیا اس لئے اس کے پرکھنے میں بھی ذوقِ نظر کا دخل نہ ہونا چاہیئے۔ تصاویر نوجوان عورتوں کی نہیں ہیں بلکہ "جہاں دیدہ" اور "الم آزمودہ" مصورو

کی ہیں اس لئے چالیس سال یا اس سے کم عمر والوں کے ذوق کی تشفی نہ ہو سکے تو ہم کو معذور سمجھا جائے۔

اُردو شعر و ادب میں ابھی سجاد علی انصاری علیگ مرحوم کا نام زندہ ہے۔ اس جوانا مرگ بے مثل اور بے پناہ ادیب شاعر اور طنز نگار کو بھولنا آسان بھی نہیں ہے۔ سجاد کی یاد میں (غالباً ۱۹۲۵ء) میں ہم سب نے ان کے مضامین اور اشعار کا مجموعہ محشرِ خیال کے نام سے شائع کرایا تھا۔ سجاد کے مخالفین بھی تھے لیکن ان کے فن ان کے اسلوب اور ان کے خلوص کا زمانہ قائل تھا۔ مہدی اور سجاد اسی میخانہ علی گڑھ کے رندانِ قدح خوار تھے۔ دونوں میں فرق تھا لیکن دونوں کا اپنا اپنا مقام تھا جواب تک ہماری نظر میں ہے لیکن اب بھی ہماری دسترس سے باہر ہے۔ ان دونوں کے بارہ میں اس وقت اصغرؔ کے دو مصرعے بار بار اور بے اختیار یاد آتے ہیں ؎

(۱) مہ و انجم سے بہتر ایک جامِ آتشیں ہوتا!

(۲) بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں!

سجاد مرحوم کا ایک ڈراما ان کی زندگی کی ٹریجڈی پر ختم ہوا تھا، ہم اصغر صاحب کے بدل ممنون ہیں کہ ان کی وساطت سے روزِ جزا کے اوراق دستیاب ہوئے۔ چونکہ سجاد

مرحوم کی یہ آخری ادبی یادگار ہے۔ اس لئے ہم جوں کا توں نذرِ ناظرین کرتے ہیں۔

سجاد انصاری کے بارہ میں کہا جاسکتا ہے کہ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

وہ اپنی آگ میں خود خاکستر ہو گئے اس ڈراما میں وہی دبی ہوئی چنگاریاں ملتی ہیں ؎

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!

روز جزا میں خیر و شر کو ٹکرانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور نہ اہرمن و یزداں کو ایک دوسرے کا حریف قرار دیا گیا ہے۔ روز جزا میں خیر و شر کو متیقن کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان کا تضاد نمایاں نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کے تناسب کو متعین کرنا چاہا ہے۔ اور اسی نیت اور نظر سے اس کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے حالی کو محب وطن کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس سے نہ صرف حالی کی زندگی اور شاعری پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ضمناً وطن دوستی کا صحیح اور اسلامی تصور بھی سامنے آجاتا ہے مزید براں ان کا مخصوص طرز تحریر (جس کے نمونے کم نظر آتے ہیں)، بھی قابل توجہ ہے۔ اس قلندرانہ بانکپن کی مثال اب تک ان کی شخصیت تھی۔ یہ جدت دیکھئے کیا رنگ

لاتی ہے ؎

اس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں!

باب تنقید میں صرف چند متفرق مطبوعات کا بے ترتیب تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ سال بھر کی مطبوعات کا اس طور پر جائزہ لیا جائے کہ ہم اپنے شعر و ادب کے بعض رجحانات کا پتا لگا سکیں، ہمارے نزدیک یہ طریقۂ کار زیادہ دلچسپ ہے اور کار آمد بھی۔ یہ ہماری پہلی کوشش ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ اس کو بہتر اور دلچسپ تر بنا سکیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آیندہ ہندی اور انگریزی ادبیات کے میلانات کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ اس طور پر توقع یہ کی جاتی ہے کہ ہم اپنے ادب کو دیگر ادبیات سے ہم آہنگ و متوازن رکھ سکیں گے۔

حصۂ نظم بظاہر مختصر ہے لیکن اپنی خوبیوں کے اعتبار سے یقیناً قابلِ اعتنا ہے، اس حصہ کو عمداً مختصر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ نثر اس وقت نظم سے زیادہ ہماری توجہ کی مستحق ہے۔ اس بارہ میں اختلاف آرا ممکن ہے۔ لیکن ہماری نیت بخیر ہے اور یہی ہماری جوابدہی ہے۔

تصاویر میں سے دس مغربی مصوروں کے موقلم کا نتیجہ ہیں دوسار دا اکبیل کی ایک چغتائی کی اور ایک ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب کی۔ مغرب کے جدید مصوروں کی اہمیت سے عام طور پر ہم ناآشنا ہیں اس لیئے ان کی زندگی اور حالات مختصر طور پر بیان کئے جائیں گے۔ ان مصوروں کا جذبۂ بے اختیار شوق اور استواری عزم ہندوستان کے مصوروں ہی کے لئے نہیں بلکہ موچیوں کے لئے بھی قابل تقلید ہے!

سہیل کی ترتیب طباعت اور اشاعت میں اوّل تو میں خود اپنا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے میں براہِ راست یا ناظرین سہیل براہ ترکستاں کسی نااہل یا نامعقول کے شکرگزار ہونے پر مجبور ہوتے۔ گو اس کا وعدہ نہیں کرتا کہ آئندہ بھی ایسا کر سکوں گا!

اپنے بعد اپنوں ہی میں سے سب سے زیادہ احسان مند ہیں آل احمد سرور صدیقی ام اے کا ہوں جنہوں نے سہیل کی خاطر نہ اپنی عزت و عافیت کی پروا کی اور نہ دوسروں کی۔ میرے شوق فضول کو انھوں نے اپنی جرأتِ رندانہ سے جہاں تک پہنچایا وہ ناظرین کے سامنے ہے۔ مجھے بذاتہٖ سرور صاحب کے

سلیقہ، ذہانت اور تندہی پر اس درجہ اعتماد ہے کہ میں ہر ایسے کام کو اپنے سر لے لیتا ہوں جس میں سرور صاحب میرے معین و مددگار ہو سکتے ہیں یعنی اُن سے بیگار لی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے کام آتش کو اپنی جوانی میں بہت کرنے پڑے اس لئے سرور صاحب سے کام لینے میں باہر والوں سے جو سرخروئی ہوتی ہے وہ تو اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن اصلی نفع وہ تسکین ہے جو سرور صاحب کی بیگار سے میرے جذبۂ انتقام کو پہنچتی رہتی ہے۔ دعا ہے کہ آئندہ چل کر ان کو بھی کوئی سرور مل جائیں۔

ہاں تو تکلفات برطرف، سہیل میں سب کچھ کیا دھرا سرور صاحب کا ہے اور اس سلسلہ میں ہر تعریف و تحسین کے مستحق وہ ہیں۔ خامیوں کا ذمہ دار میں ہوں اور یہ ایثار اس اعتماد کی بنا پر ہے کہ اس میں کوئی خامی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کا اعتماد بجائے خود مستقل خامی ہے۔ لیکن جس طور پر انگریزی میں اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے، اسی طور پر اردو میں بات میں بات نکل آتی ہے۔ چنانچہ اعتماد کے سلسلہ میں یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ جتنا مجھے سہیل کے ہمہ صفت موصوف ہونے پر اعتماد ہے اتنا خود ناظرین کو میری خلوص نیت پر اعتماد نہیں ہو سکتا کیونکہ قاضی جلال الدین صاحب نے

ایک بار آہِ سرد کھینچکر اور غم و غصّہ کو تول کر فرمایا تھا:

خلوص کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے

لیکن اگر میری خلوص نیت پر کسی کو اعتبار نہیں ہے تو مجھے ہر شخص کے اصابتِ رائے پر بھی ایمان نہیں ہے۔ کیونکہ انسان خطا و نسیان سے مرکب ہے اور اس میں کیا حرج ہے کہ میں اس مقولہ کا مورد اپنے اور سرور صاحب کے علاوہ بقیہ سب کو سمجھوں! دلائل غلط ہوں تو کیا مضائقہ نتیجہ تو صحیح ہے۔ اب بھی آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو میرا کیا قصور ہے ؎

پسرِ نوح با بداں بہ نشست
خاندانِ نبوّتش گم شد

یہ شعر چسپاں ہونے کی خاطر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ صرف سیّدین صاحب کی ضد میں لکھا گیا ہے جنھوں نے عابد صاحب سے متاثر ہو کر ایک نئے آرٹ کی طرح ڈالی ہے جس میں ہیں دونوں کا حلیف بھی ہوں اور حریف بھی کہ کون شخص کتنا جلد اور کس بے تکے پن سے دورانِ تقریر یا تحریر میں ایسے اشعار یا فقرے "چست" کر سکتا ہے جن کو موضوع، موقع یا محل سے دُور دُور کا لگاؤ نہ ہو۔ یہی لیل و نہار رہیں تو سرور صاحب بھی کبھی اس زمرہ (شعر؟) میں آجائیں گے! سعی اور منّی قسم کی حرکتوں

کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اتمام من اقتدبہ ہر نوع مسلّم ہے

٭

اس سلسلہ میں نور الرحمٰن صاحب بی اے (علیگ) کا خاص طور پر ممنونِ کرم ہوں تصاویر کی طباعت اور سرِ ورق کی تیاری میں نور صاحب نے جس انہماک اور تندہی سے کام لیا ہے اس سے اکثر میں خود گھبراگیا ہوں۔ اس قسم کے تمام کام نور صاحب کو سپرد کر کے میں اطمینان سے بیٹھ گیا اور چاہتا تھا کہ اطمینان سے بیٹھا رہوں لیکن نور صاحب نے چین نہ لینے دیا اور توقعات سے کہیں پہلے ساری چیزیں مکمل کرادیں آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ایک منظم پروگرام میں اس قسم کی مستعدی کتنے رخنے پیدا کردیتی ہے۔ میں اطمینان سے کام کرنے کا عادی ہوں۔ نور صاحب ہر کام کو جلد سے جلد پورا کر دینے کے خوگر! تیسری وقت مرشد کی طرف سے نازل ہوئی۔ آپ کا مسلک یہ ہے کہ کام جلد جلد کرو لیکن اسے پورا نہ ہونے دو۔ اول تو ان سے دیر دیر سے ملاقات ہوتی تھی اور جب ہوتی تو ہمیشہ یہ کہتے کہ سہیل کے شائع کرنے میں آپ بڑی تاخیر کر رہے ہیں جب میں یہ کہتا کہ آپ کے مضمون نہ ملنے سے دیر

ہو رہی ہے تو کوئی نہ کوئی مضمون فوراً لکھنا شروع کر دیتے اور نامکمل چھوڑ کر چلے جاتے مزید تقاضوں پر کوئی اور موضوع اختیار کر لیتے اور اسے نامکمل حالت میں چھوڑ کر روانہ ہو جاتے۔ بالآخر پانی پت کے میدان میں یہ معرکہ سر ہوا!

پیامِ اقبال

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے (اقبالؔ)

اقبالؔ کی شعر و شاعری من حیث الکل اس عالمگیر ہیجان اور اضطراب کا آئینہ اور نتیجہ ہے جو دنیائے اسلام پر عرصہ سے طاری ہے اس لئے قبل اس کے کہ ہم براہِ راست نفسِ مسئلہ پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہوں یہ بہتر ہوگا کہ ہم ایک سرسری جائزہ ان حالات اور واقعات کا لے لیں جن سے اقبالؔ کی شاعری کے ابتدائی اور ارتقائی مراحل وابستہ ہیں۔ بنظر سہولت اس مسئلہ کی ان دو نوعیتوں کا بھی ابتدا ہی میں تذکرہ کر دینا مناسب ہوگا جو اس صورتِ حال کی نہایت وضاحت کے ساتھ ترجمانی کرتے ہیں۔ اول تو وہ واقعات جو بیرونی دنیائے

اسلام پر گزر گئے اور دوسرا وہ اندرونی انقلاب جس نے بحیثیت مجموعی ایک ہندی مسلمان شاعر کی قلب ماہیت کردی۔ جہاں تک ہندوستان کی تاریخ کا تعلق ہے سلطنت مغلیہ کا زوال، غدر کی دار و گیر، غیر ملکی فاتحین کا استیلا، عام مسلمانوں کی تباہی، ان کی اخلاقی مذہبی، تعلیمی اور سیاسی شکست و ریخت، مغربیت کا عروج، ایسے واقعات تھے جنھوں نے ہندی مسلمانوں کے لئے ہند کی سرزمین کو نہایت تنگ اور تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ لیکن جیسا معلوم ہے اسلام جغرافیائی حدود سے بالکل بے نیاز ہے۔

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

کی بنا پر اس کا مقصد رسالت دنیا کے ہر گوشے اور ہر کلمہ گو سے وابستہ ہے اس لئے اس کی اخوت اور عقیدت عالمگیر ہے۔ یہاں پہنچکر ہر مسلمان طبعاً مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ تمام دنیائے اسلام کے حالات اور واقعات کا جائزہ لے اور اس کی تعمیر و تزئین میں ہر ممکن قربانی کے لئے مستعد ہو جائے۔ پچھلی پچاس سالہ زندگی جن محرومیوں کی ترجمان تھی اس کا اقتضا تھا کہ وہ اپنے ماضی اور حال کی روداد حیات کا مطالعہ کر کے یک لخت بیدار ہو جاتا اور چونکہ بیداری اپنی گزشتہ جمود کا ردعمل ہوتی ہے۔ اس لئے ان حالات کے ماتحت جو افعال صادر و سرزد ہوتے ہیں وہ ایک حد تک غیر متعین اور بسا اوقات اندیشہ ناک

بھی ہوتے ہیں۔ ہندی مسلمانوں پہ جو حالت گزر چکی تھی یا جو اب گزر رہی ہے اس کا احساس ہم کو ہے اور اس پر اظہار خیال کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اس دوران میں بیرونی عالم اسلام پر جو حالت گزر گئی اس نے ایک حد تک ہمارے ان معتقدات کو متزلزل کر دیا جو اب تک ہمارے نزدیک مسلمات میں شمار ہوتے تھے۔ مراکش الجیریا، ٹیونس، طرابلس، بلقان، ترکی، عرب، فارس، مصر تہذیب حجازی کے حصن حصین تھے۔ لیکن زمانہ کی نیرنگیوں نے جو فی الحقیقت کچھ نہ تھیں، لیکن ہماری خود فراموشیاں اور ان کے تازیانے نے ان کو وہ بنا دیا جو لسان القلب (غالب) کی زبان میں

یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

یا ترجمانِ حقیقت کے نزدیک

وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار؟

کا مرادف تھا۔

اب وقت آنے والا تھا کہ پکارنے والا پکارتا

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا | اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو | در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن | نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

بہرحال یہ شانِ نزول تھی ترجمانِ حقیقت کی۔ اب ہم کو یہ

دیکھنا ہے کہ ان بیرونی اثرات کے علاوہ خود اقبالؔ کے اندرونی اور ذہنی انقلابات کیا تھے اور کیوں تھے؟ جہاں تک اس صنف شاعری کا تعلق ہے جس کے اقبالؔ علم بردار ہیں یا جواب تدریج عام ہو رہی ہے، بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے، اقبالؔ کی شاعری عین مقتضائے وقت و فطرت تھی۔ اگر اس کے تاریخی پہلو کو مدنظر رکھئے تو یہ کہنے میں کس کو تامل ہوسکتا ہے کہ جذبات نگاری، بلند پروازی، الفاظ اور فقروں کی میناکاری و موسیقی اور ان سب کے مجموعے کو سحرِ حلال بنا دینے والا، اردو میں ایک ایسی شاہراہ کھول گیا تھا جس کا کسی کو گمان بھی نہ تھا، یعنی

غالبؔ نام آورم نام و نشانم مپرس
هم اسد اللهم هم اسد اللهیم

مجھے اپنے ایک بزرگ کے قول کا احترام ہے کہ اگر غالبؔ نہ ہوتے تو حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ بھی نہ ہوتے لیکن اس سے جو نتیجہ انھوں نے نکالا ہے اس سے اسی احترام کے ساتھ اختلاف بھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ نے جو پیغام پہنچایا ہے اور جس کی بنا پر ان کی شاعری دوسرے تمام شاعروں سے ممتاز و متمائز ہے وہ بھی غالبؔ کے حصے میں آنی چاہیئے بذاتہ میں غالبؔ کو اپنے عہد کا ترجمان نہیں تصور کرتا۔ لیکن

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی اردو کے بے مثل شاعر ہونے میں مجھے کبھی شک رہا ہو۔ ہر شاعر کی حیثیت، اس کی خصوصیات سے جانچنی چاہیئے۔ اس طور پر میں میرؔ، مومنؔ، سوداؔ، انیسؔ، داغؔ، حالیؔ، شبلیؔ، اکبرؔ، فانیؔ، اقبالؔ اور حسرتؔ سب کو ایک مخصوص صنف اور اندازِ کلام کا امام تصور کرتا ہوں اور وہ بھی بغیر اس امر کو معرضِ بحث میں لائے ہوئے کہ شیکسپیئرؔ، ملٹنؔ، ورڈس ورتھؔ، کیٹسؔ، شیلیؔ اور ٹینیسنؔ کو اپنی اپنی جگہ پر کیا درجہ حاصل ہے۔

بہر حال یہ ایک ضمنی حیثیت تھی اس عقیدے کی جس کا ابھی ابھی تذکرہ کیا گیا تھا۔ یعنی وقت اور زمانے کے اعتبار سے اقبالؔ کی شعر و شاعری بالکل برمحل واقع ہوئی ہے۔ ایک عالمگیر تباہی و بربادی کے بعد روحِ قومی جس طور پر بیدار ہوتی ہے یا بیدار کی جاتی ہے اس کا نمونہ اقبالؔ کا عہد اور اقبال کی شعر و شاعری ہے۔ یہ بحث تو اقبالؔ کی شعر و شاعری کے زمان اور مکان سے متعلق تھی۔ اب ہم کو اقبال کی شعر و شاعری کے ارتقا و نمو کا جائزہ لینا چاہیئے۔

اقبالؔ کی شعر و شاعری کی محض اس طور پر تفتیش کرنی کہ وہ کہاں پیدا ہوئے تھے اور ان کی ابتدائی تعلیم کہاں اور کیسے ہوئی اگر غور کیا جائے، تو کسی حد تک اتنی اہم نہیں ہے جتنی

اہمیت اس کو مسٹر فارسٹر نے دی ہے۔ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ اقبال پنجاب میں پیدا ہوئے جو ہندو مسلمانوں کے باہمی اختلاف وکشیدگی کے لئے مشہور ہے' انھوں نے اس امر کا بھی اعادہ کر دیا ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری کی ابتدا بجائے قومی رنگ کے مذہبی پہلو سے کی ہے اور حالی کی طرح اقبال کا بھی ابتدائی کلام ان کے ہم مذہبوں ہی کے لئے ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر مسلمان خواہ وہ زندگی کے کسی مرحلہ میں ہو اور اس کا کوئی مشغلہ ہو' فطرتاً مذہبی واقع ہوا ہے۔ اقبال اگر پنجاب کی سرزمین پر نہ بھی پیدا ہوتے تو جن حالات کے ماتحت جس نہج پر اور جن شاعرانہ اور حکیمانہ انداز سے انھوں نے شریعت اسلامی کا مطالعہ کیا ہے اس کا اقتضا یہی تھا کہ آج وہ دنیا کے سامنے اسی حیثیت سے نمودار ہوتے جس حیثیت میں آج ہم ان کو پاتے ہیں۔ یورپ کا سفر اختیار کرنے سے پہلے انھوں نے جتنی نظمیں لکھی ہیں ان سے پتا لگانا ایک حد تک دشوار ہے کہ ان کے جذبات ان شعلہ نوائیوں کے لئے بیدار ہوں گے جنھوں نے بالآخر" وادی فاران" کے ہر ذرے کو "چمکا دینے" کی دعوت دی۔ اقبال کی شاعری ہندوستانی سیاست سے نہیں تو کم از کم ہندو مسلم کشاکش سے تو بالکل بے نیاز ہے اور یورپ کے ایک مقتدر محقق کو اس طور پر سخت مغالطہ ہوا ہے

مسٹر فارسٹر نے شکوہ کو اقبال کی ابتدائی نظم تجویز کیا ہے۔
شکوہ، جواب شکوہ، ترانۂ ملی، بلاد اسلامیہ اور مسلم وغیرہ ان کے تیسرے (موجودہ) دور میں تصنیف ہوئی ہیں اور یورپ سے واپس آنے کے بعد لکھی گئی ہیں۔ اس لئے یہ نتیجہ نکالنا صریحی طور پر غلط ہے کہ یہ نظمیں بالخصوص شکوہ ان کے ہندو دوستوں کی دل شکنی کا باعث ہوئیں اور اس کی تلافی اقبال نے ہندی ترانہ لکھ کر کی۔ یہ بھی غلط ہے کہ اقبال نے نیا شوالہ ۱۹۱۶ء میں لکھا۔ بقول مسٹر فارسٹر، اقبال نے اپنے ہندو دوستوں کی آزردگی سے متاثر ہو کر ترانہ ہندی ترتیب دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نیا شوالہ، ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، یہ تمام نظمیں اقبال کی بالکل ابتدائی دور شاعری کی ہیں۔ دوسرے دور کی نظمیں وہ ہیں جو تقریباً تمامتر یورپ کے دوران قیام میں لکھی گئیں اور ان میں بھی کوئی نظم ایسی نہیں پائی جاتی جو پورے طور پر ان کے تیسرے دور کی نظموں کی نقیب کہی جا سکے یورپ سے واپس آنے کے بعد ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۵ء تک جتنی نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں کثرت سے ایسی ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے فضائے تخیل میں اسرار اور رموز کا ہیولیٰ مرتب ہو رہا تھا
سفر انگلستان کے دوران میں جس واقعہ نے سب سے پہلے اقبال

کے قلب کو متاثر یا مجروح کیا وہ "تہذیبِ حجازی کا مزار" سسلی کا باصرہ نواز جزیرہ تھا جس کا مرثیہ اقبال نے انتہائے جوش و شدت کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ ایک مسلمان شاعر کے اس دل کی چوٹ تھی جس کی نظروں میں اسلام اور اس کے جاں نثاروں سے زیادہ کوئی محبوب نہ تھا۔ دیکھیے ان پارہ ہائے جگر میں کیسے کیسے الماس ریزے ہیں

یہ محل خیمہ تھا ان صحرا نشینوں کا کبھی — بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
آفرینش جن کی دنیائے کہن کی تھی اجل — جنکے ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل
زندگی دنیا کو جنکی شورشِ قُم سے ملی — مخلصی انساں کو زنجیرِ توہم سے ملی
آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو — رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
ہے ترے آثار میں پنہاں کسی کی داستاں — تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں — جسکی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رُلواؤں گا

یہ بحث ایک حد تک ضمنی تھی۔ لیکن اس کے متعلق اظہار خیال کرنا یوں ضروری تھا کہ اقبال کی مختلف نظموں کی صحیح تاریخ نہ معلوم ہونے کے سبب سے یورپ کے ایک مقتدر فاضل کو مغالطہ ہوا ہے جس کے نظریہ کو تسلیم کرنے کے بعد اقبال کے متعلق بعض ایسے انکشافات ہوتے تھے جن کو ان کی شاعری کی تاریخ میں داخل کرنا اقبال کے ساتھ

انتہائی ناانصافی ہوتی۔

اقبالؔ کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کے اوائل کی طالب علمانہ زندگی شعر و شاعری کے کیف سے آشنا تھی۔ لیکن ان کے شاعرانہ اور ادبی ذوق کی ابتدائی تہذیب اور تکمیل کی بنیاد داغؔ اور میر حسنؔ کے ہاتھوں سے پڑی۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اقبالؔ کا مستقبل اب تک غیر متقیقن تھا۔ اور یہ سر ٹامس آرنلڈ کا فیضانِ صحبت تھا جس نے اقبال کے دل میں فلسفہ کا صحیح ذوق پیدا کر دیا اور بہت ممکن ہے یہ سر ٹامس آرنلڈ ہی کا تصرف رہا ہو جس نے اقبال کو یورپ سے دلچسپی پیدا کرادی۔

اقبال کا عازم یورپ ہونا ان کے شاعرانہ اور فلسفیانہ جذبات کے لئے ایک پیام ہیجان و طغیان تھا جو یورپ کی آب و ہوا میں پورے طور پر پیدا ہو گئے۔ رحمت و عافیت کی وہ فضائیں جو صرف مشرق میں نظر آتی ہیں، اغیار اکثر ان کو جمود و ظلمت کا مرادف قرار دیتے ہیں۔ کچھ لوگ تو اس صورت حال کو مشرق کی آب و ہوا کا رہین منت تصور کرتے ہیں، دوسرے اس کو مذہب اور مذہبیت کا ایک تحفۂ بے جان قرار دیتے ہیں بہت ممکن ہے ایسا ہو لیکن اس سلسلہ میں بے موقع نہ ہوگا اگر ہم اس حقیقت کا سراغ لگالیں کہ آیا خود مشرق کے لئے بحیثیت مجموعی مذہب باعث رحمت ہے یا

نہیں۔ وہ لوگ جو مذہب کو علم و حکمت کا دشمن تصور کرتے ہیں' اس کا جواب نفی میں دینگے۔ لیکن خود وہ سرزمین جو مذہب کو ترقی کے راستہ میں سنگِ راہ تصور کرتی ہے ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جو اس کو یورپ کے دیرینہ آشوب' تجارتی مسابقت' جنگ و جدل اور "زبردست زیردست آزار" کے مہلک انجام سے اس کو نجات دلا سکے۔ سرزمین یورپ کا ہر انقلاب اور ہر محرومی' خواہ اس کی کچھ نوعیت ہو' اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اس کے موجودہ نظریات زندگی ناکامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جہاں تک دنیاوی ترقیوں کا مدار ہے اور تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیا جائے کہ ان دنیاوی ترقیوں کو یورپ کے موجودہ مسلمہ معیار سے جانچنا چاہیئے' خود مشرق کو مذہب سے کیا فائدہ پہنچا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو مشرق نے باوجود اس کے کہ وہ مشرق تھا اور ان تمام روایات اسباب اور استعداد و میلانات کا حامل جن کے ماتحت اس کی تعمیر و تہذیب ہوئی تھی' اس نے یورپ کی تقلید کی یا یوں سمجھئے اس نے یورپ کا اثر قبول کیا' دوسرے یہ کہ یورپ کی اس ہنگامہ زائی نے مشرق میں مذہب کا مفہوم بدل ہی نہیں دیا بلکہ اس کو مسخ بھی کر دیا۔ اس طور پر نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کی محرومی مذہب کے عدم احساس اور مشرق کا خسران مذہب کے غلط

مفہوم سے وابستہ ہے۔ اس سلسلہ میں ضمناً اس مسئلہ کو اٹھانا غالباً بے موقع نہ ہوگا کہ خود مذہب کیا ہے؟ مذہب نام ہے اس تعدیل کا جو انسان کی انتہائی کمزوریوں اور انتہائی قوتوں میں فرق مراتب رکھتی ہے اور ان کو مندرج کرتی رہتی ہیں۔ عبدیت اور نیابت کا مسئلہ اسی محور (تعدیل) پر گردش کرتا ہے۔ یہ بحث اپنے تنوعات کے اعتبار سے نہایت طویل اور معرکۃ الآرا ہے اس لئے اس کو یہیں ختم کر دیا جاتا ہے۔ مذہب اور سائنس کی اس جنگ نے (جس کے ذمہ دار خود یہ دونوں اتنے نہیں ہیں جتنے ان کے گمراہ یا سادہ لوح علمبردار) دنیا کو ایک شہرستان بنا رکھا ہو اسی عالم اور اسی زمانے میں اقبال نے اپنے جذبات کو برافگندہ نقاب کیا ہے۔

اقبال نے مذہب اور فلسفہ و حکمت دونوں کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ مذہب کی کارفرمائیاں تو وہ دیکھ اور سمجھ چکے تھے اب ضرورت اس امر کی تھی کہ کچھ دن اس سرزمین پر اور ان لوگوں میں بسر کئے جائیں جو فلسفہ اور حکمت کے مدعی تھے اور جن کے نزدیک مذہب اپنی رسالت میں ناکامیاب ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں مذہب سے یکسر معرا ہو کر محض مادہ اور قوت کی کارفرمائی کا نمونہ اگر کہیں اپنی انتہائی برہنگیوں کے ساتھ مشاہدہ کیا جا سکتا تھا

تو وہ یورپ کی سر زمین تھی اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اقبال نے دنیا کے سامنے جو قطعی پیغام پیش کیا ہے وہ کلیتہً ان مشاہدات اور تجربات کی بنا پر تھا جن کو انھوں نے یورپ اور یورپین مصنفین سے آشنا ہونے کے بعد ترتیب دیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ اس طور پر اقبال نے یورپ یا یورپین مصنفین سے کوئی حقیقت مستعار لی ممکن ہے مفہوم واضح نہ ہو سکا ہو۔ اس لئے یہاں اس کا ایک تفصیلی جائزہ لینا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ عام خیال یہ ہے کہ اقبال کے "انسان کامل" (سوپر مین) کا ماخذ کمتر یا بیشتر نیٹشے ہے۔ لیکن یہ خیال جس قدر عام ہے اسی قدر غیر صحیح بھی ہے۔ خود اقبال کا بیان ہے کہ انھوں نے تصوف کے مسئلہ انسان کامل پر کم وبیش پچیس برس ہوئے لکھا تھا جب کہ نیٹشے کا گذران کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ دوسری حقیقت جو اس بیان کے جواز میں پیش کی جاسکتی ہے اور جس کا تذکرہ خود ایک یورپین مصنف نے کیا ہے کہ نیٹشے امارت نسلی کا قائل اور وجود باری کا منکر تھا۔ حالانکہ اقبال کے کلام کا ایک سطحی مطالعہ بھی اس حقیقت کو واضح کرسکتا ہے کہ اقبال اور اسلام دونوں اس نظریہ کے مخالف ہی نہیں بلکہ دشمن ہیں۔ اقبال کے نزدیک جو نیٹشے کی وقعت ہے اس کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

از ہستی عناصرِ انساں دلش تپید ؎ فکرِ حکیم پیکرِ محکم تر آفرید
افگند در فرنگ صد آشوب تازہ ؎ دیوانہ بکارگہ شیشہ گر رسید

لیکن بعض حیثیت سے نیٹشے کے افکار مذہب اسلام سے بہت قریب ہیں جس کا اقبال نے یوں اعتراف کیا ہے :

آنکہ بر طرح حرم بت خانہ ساخت ؎ قلب او مومن دماغش کافر ست

اس کے افکار کے متعلق اقبال کی ہدایت یہ ہے :-

خویش را در نار آں نمرود سوز ؎ زانکہ بستانِ خلیل از آذر ست

رہا یہ امر کہ ممکن ہے دوسرے شعرا یا مصنفین کے اقبال معتقد ہوں اس کے متعلق یہ نقشِ فرنگ پیش کر دینا کافی ہوگا "دانایانِ فرنگ" یوں مخاطب کئے گئے :-

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری ؎ عجب این ست کہ بیمارِ تو بیمار تر ست
خواجہ از قیمتِ عیش ست اگر مزدِ غلام ؎ بندہ آزاد تر و خواجہ گرفتار تر ست

پہلا شعر ان لوگوں کے لئے ایک پیغام بصیرت ہے جو یورپ کی تعلیم اور ترقی پر سر دھنتے ہیں حالانکہ وہ اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کرتے کہ ان تمام ذہنی اور مادی نام نہاد ترقیوں نے یورپ کے انسانوں اور انسانیت کو کس سطح پر پہنچا دیا ہے۔ ترقی کا معیار یہ ہے کہ کس ملک اور کس قوم کی زیادہ سے زیادہ تعداد نے ایسی ترقی کی جو اپنے اور دوسروں کی کامرانی و عافیت کا باعث ہوئی۔ اس نظریہ

کے ماتحت اگر یورپ کی ترقی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا اس کی حالت کسی طور پر قابل رشک نہیں ہے۔ ممکن ہے مشرق کی موجودہ حالت بھی قابل اطمینان نہ ہو اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن اس کا باعث یہ نہیں ہے کہ ہم مغرب کی تقلید نہیں کرتے۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ مشرق کی محرومی ایک بڑی حد تک مغرب کی تقلید کے سبب سے ہے مغرب کی جو شے ہم کو مسحور کئے ہوئے ہے وہ فی الحقیقت مغرب کی کمزوریاں ہیں۔ ہماری نظر مغرب کی خوبیوں پر نہیں پڑتی اور اس کا سبب محض یہ ہے کہ ایک پست اور درماندہ قوم دوسری قوم کی کمزوریوں کی سہولت کے ساتھ تقلید کر سکتی ہے اور چونکہ خوبیوں کی پیروی زیادہ محنت، کاوش، صبر و استقلال کی طلب گار ہوتی ہے اس لئے کمزور اقوام یا افراد اس طرف متوجہ نہیں ہوتے

اقبال نے ایک مقام پر جلال اور ہیگل کا موازنہ کیا ہے۔ موقعہ یہ ہے کہ اقبال کا ہیگل کے فلسفہ میں غوطہ لگانا تھا کہ

کشتی عقل گشت طوفانی

تھا پیر یزدانی نے نمودار ہو کر آواز دی

بہ سراب بے سفینہ می رانی!

اور آخر میں یوں بحث ختم کر دی

به خرد راهِ عشق می پوئی؟ به چراغ آفتاب می جوئی؟

ان مثالوں سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں ہے کہ اقبال "دانایانِ فرنگ" کے سرے سے منکر ہیں بائرن، ہیوگو اور گوئٹے وغیرہ کی انھوں نے نہایت کشادہ جبینی کے ساتھ پزیرائی کی ہے گوئٹے اور جلال الدین رومی ارم میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں "پیر عجم" نے "نکتہ دان المنی" کی یوں ستائش کی ہے

گفت رومی ایں سخن را جاں نگار | تو ملک صید استی و یزداں شکار
فکرِ تو در کنج دل خلوت گزید | ایں جہانِ کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دادۂ | در صدف تعمیرِ گوہر کردۂ
ہر کسے از رمزِ عشق آگاہ نیست | ہر کسے شایانِ ایں درگاہ نیست

داند آں کو نیک بخت و محرم ست
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم ست

"دیارِ مغرب" میں اپنے متموج جذبات کا اظہار اقبال نے اپنی ایک مشہور نظم میں کیا ہے جس کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے تھے وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس ہیں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

یہ نظم بھی افتتاحیہ ان خیالات اور پیغامات کی جنھوں نے بعد میں اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی اور پیغامِ مشرق کا جامہ اختیار کر لیا۔ اس نظم کے مفہوم کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد یہ تیقن کرنا بالکل آسان ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ نے یورپ کی تعلیم و تلقین کے سامنے سر خم کیا یا نہیں۔؟ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اقبالؔ نے یورپ کے قیام میں کیا کیا اور اس کا اثر کن نوعیتوں سے ان کے کلام پر پڑا۔ کیمبرج میں رہکر اقبالؔ کو آرنلڈ ڈاکٹر میک ٹیگرٹ، براؤن، نکلسن اور سارے کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ہستیاں جس پایہ کی ہیں؟ اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے، ان نقوش کے متعلق زیادہ کد و کاوش کرنے کی ضرورت نہیں باقی رہتی جو اقبالؔ کی علمی زندگی اور شاعرانہ ذوق پر مرتسم ہوئے ہوں گے۔ لیکن اقبال کی زندگی جن اثرات کی سب سے زیادہ رہینِ منت رہی وہ خود ان کا مطالعہ اور مشاہدہ تھا۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ رہنموں تھے۔ اقبالؔ کے لئے یہ موقع نہایت غنیمت تھا، ایک طرف تو وہ فارسی فلسفہ اور تصوف کا عمیق مطالعہ کر رہے تھے، دوسری طرف یورپ کا میدان رستخیز ان کی نظروں کے سامنے تھا۔

مغرب کے جن واقعات اور حالات نے اقبالؔ کو مخصوص طور پر متاثر کیا، مختصراً حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(۱) لا مذہبی۔

(۲) مادیت کا استیلاء

(۳) سرمایہ دار اور مزدور۔

(۴) شہنشاہیت یا جوع الارض۔

(۵) عسکریت۔

(۶) سیاسی خداعت۔

(۷) نوعی ہمدردی اور اخوت کا فقدان۔

(۸) سائنس کی محشر زائیاں۔

اس کے ساتھ ساتھ مشرق کے یہ حالات پیشِ نظر تھے۔

(۱) مذہب کا غلط مفہوم اور اس کی غلط تاویلات۔

(۲) علم و حکمت سے بیزاری۔

(۳) محکومی اور غلامی۔

(۴) مذہبی اور قومی مناقشات۔

(۵) افلاس و کس مپرسی۔

(۶) مغرب کی چیرہ دستی۔

(۷) کورانہ تقلید۔

ان امور کو ذہن نشین کرنے کے بعد اقبال کی ذہنیت کا پتا لگانا آسان ہو جاتا ہے مشرق پر جو کچھ گزر رہا تھا اور اسکے جو کچھ نتائج تھے اقبال ان سے کافی آشنا ہو چکے تھے۔ ان کے سامنے اب یہ مسئلہ تھا کہ وہ کون سی چیز ہے جس نے مشرق کو اس درجہ پست کر دیا اور بحالت موجودہ جو باتیں مشرق کی محرومیوں میں شمار کی جاتی تھیں ان کو ترک کر دینے کے بعد اگر کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جاتا (یعنی مغرب کی تقلید) تو صورت حال میں کوئی مفید تبدیلی پیدا ہو سکتی تھی یا نہیں؟ اس طور پر اقبال کیلئے مغرب کی زندگی کا مطالعہ کرنا لازمی ہو گیا۔ لیکن ان کو جیسا کہ اس مضمون میں کہیں عرض کیا جا چکا ہے جلد محسوس ہو گیا کہ "متاع یوسفی" ارض مغرب سے بھی ناپید ہے۔

یورپ کے مذہبی میلانات کے متعلق صرف ایک واقعہ کا تذکرہ غالباً یہاں کافی معنی خیز ہو گا کہ ایک زمانہ میں کسی ستم ظریف نے پریس میں یہ سوال پیش کیا کہ دنیا میں اب تک سب سے بڑی ہستی کون گزری ہے۔ اس پر ووٹ لئے گئے سب سے زیادہ ووٹ شیکسپیر کو ملے۔ جناب مسیح کو نسبتاً اتنے ووٹ بھی نہیں ملے جتنے پچھلے سال انگلستان کی لبرل جماعت کو ملے تھے!

اب رہی مادہ پرستی۔ علم و حکمت نے جن انسانی قابلیتوں

اور صلاحیتوں کو آج بیدار کر دیا ہے ان سے کون آشنا نہیں۔
نوامیس فطرت کو جس طور پر انھوں نے بے نقاب کیا ہے اور

بر عناصر حکمراں بودن خوش ست

کا جو نمونہ مغرب نے پیش کیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے اور ہم میں کثرت سے ایسے لوگ مل جائیں گے جو ان کی اس سرفروشانہ سعی و کاوش کی داد دینے کے لئے آمادہ ہوں گے۔ لیکن اس کا مقصد اہلِ مغرب کے نزدیک جو کچھ ہے اگر غور کیا جائے تو وہی وہ حقیقت ہے جو موجودہ

آشوب ہلاکوئے فتنۂ چنگیزے

کی محرک اعظم ہے۔ ایجاد اور تحقیقات کا جہاں تک دخل ہے ہماری گردنیں مغرب کے سامنے خم ہونے کے لئے طیار ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے ذہن و دماغ میں وہ عناصرِ عبودیت نہیں ہیں جو آشوب حیات میں اعتدال پیدا کیا کرتے ہیں اور جن کو ایک مشرقی مذہب کے نام سے تعبیر کرتا ہے، ان کی یہ ساری ایجاد و تحقیقات، انسان کی عافیت اور سکون خاطر کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ کسی تنگ خیالی یا تعصب کی بنا پہ نہیں ہے۔ تاہم ممکن ہے اس سے بعض طبائع بدگمان ہوں اس لئے اس مسئلہ کو کسی قدر وضاحت سے بیان کر دینا غالباً بے محل نہ ہوگا اور اقبالؔ کے پیام شاعری

کی روح سے آشنا ہونے کے لئے ان حقائق سے باخبر رہنا لازمی ہے۔

جنگ اور امن بعض اضافی حیثیات رکھتے ہیں۔ ہر جنگ تعمیر کی اور ہر امن تخریب کا موجب ہو سکتا ہے۔ لیکن مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ اس تعمیر یا تخریب کے ذمہ دار کون سے جذبات ہیں۔ انھیں جذبات کے تجزیہ پر جنگ کی تعمیری یا تخریبی حیثیت کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت اگر یورپ کے جنگ و جدل پر نظر ڈالی جائے (اور یہاں ہم کو صرف یورپ کا جائزہ لینا ہے) تو معلوم ہو گا کہ ان کے محرکات اعظم صرف وہ میلانات ہیں جو اکثر و بیشتر طمع و خود غرضی پر مبنی ہوتے ہیں۔ یورپ کی حربی ذہنیت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کی تمام کوشش صرف اس مقصد کے لئے ہوتی ہیں کہ اگر جنگ کی نوبت آجائے تو جنگ کو صلح میں تبدیل کرنے کے بجائے فریقین ہلاکتوں کا دامن کس حد تک وسیع کرنے پر قادر ہیں۔ مغرب نے اقوام عالم یا خود آپس میں صلح قائم رکھنے کی کب اور کس حد تک کوشش کی ہے ایک عریاں راز ہے جس کی تفصیل تحصیل حاصل ہے۔ ممکن ہے کچھ تاریخی مثالیں پیش کی جائیں کہ فلاں حکومت نے فلاں موقع پر صلح قائم رکھنے کی کوششیں کیں لیکن دنیا جانتی ہے آج کل کی قوتیں صلح یا جنگ کا اقدام صرف

اپنے بازوؤں کی تاب وسکت کا اندازہ کرکے کیا کرتی ہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کی صلح یا جنگ اخلاقی معیار پر کہاں تک ٹھیک اُترتی ہے۔ مغرب میں صلح کا مفہوم اکثر طیاری جنگ کی مہلت ہے۔ ایسی حالت میں ایک ذہین اور جفاکش قوم اپنے ذرائع اور وسائل کو کس بے جگری کے ساتھ بر سر کار لاتی ہے ایک ایسا راز ہے جو کسی تفصیل کا محتاج نہیں ہے۔ انسان اپنی عافیت اور راحت کے لئے جب تک صرف مادّی قوتوں پر بھروسہ کرے گا یا ان کا متمنی ہوگا اس کی شامتیں روز بروز متیقن ہوتی جائیں گی کیونکہ مادّی ترقی اکثر و بیشتر مادّی طاقت کو بر سر کار لاتی ہے اور جب تک مادّی قوتوں سے مرافعہ کئے جانے کا امکان ہے اس وقت تک انسانی شکست و ریخت لازمی ہے۔

مادّی قوتوں کا بیدار ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان جو نسبت ہے وہ پامال کی جارہی ہے مادّی قوتیں بحیثیت مادّی قوتوں کے روحانی قوتوں سے ممزوج نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے یہ نتیجہ نکالنا قرین قیاس ہے کہ حربیت کا جو مادہ سے ربط رکھتی ہے، صلح و عافیت سے جو ایک ملکۂ اخلاقی ہے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں کسی تفصیل کی اتنی حاجت نہیں ہے جتنا خود یورپ کی ذہنیت اور اس کے نتائج کا ایک صحیح جائزہ

لے لینا۔ یورپ کے اکثر بہترین دل و دماغ آج اس فکر میں ہیں کہ وہ کس نہج و نوعیت سے دوسری اقوام عالم کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ان کو یہ فکر بہت کم دامن گیر ہوتی ہے کہ کس طریقہ سے بنی نوع انسان کو خواہ وہ دنیا کے کسی حصّے میں ہوں اپنے ایثار و قربانی یا ایجاد و اختراع سے فائدہ پہونچایا جا سکتا ہے اس امتیاز خصوصی کو مدنظر رکھ کر اس امر کا ذہن نشین کر لینا یقیناً آسان ہے کہ جو باتیں اس سے پہلے عرض کی گئی تھیں، یعنی لا مذہبی، سرمایہ دار اور مزدور، جوع الارض، عسکریت، سیاسی خداعت، نوعی ہمدردی اور اخوت کا فقدان، سائنس کی محشر زائیاں، یہ سب نتیجۂ صریح ہیں اسی مادیت اور مادہ پرستی کے اقبال کے ذہن و دماغ پر ایک طرف تو یہ سارے نقوش مرتسم تھے، دوسری طرف مشرق کا نقشہ تھا گویا ایک طرف ہلاکتیں تھیں اور دوسری طرف حسرت اور مایوسیاں!

لیکن تصویر نامکمل رہ جائے گی اگر اس سلسلہ میں، دوسری طرف مشرق کا جائزہ بھی نہ لیا جائے۔ دیگر مذاہب کے اعتبار سے اسلام کے نو عمر اور نو خیز ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک انقلابات کا تعلق ہے، اسلام نے اتنے ہی عرصہ میں زندگی اور ہلاکت کے بے شمار مراحل طے کر لیے ہیں۔ چنگیزیوں اور تاتاریوں کے سیلاب ہلاکت سے اسے سابقہ پڑا، مختلف عقائد اور

ملتوں سے یہ ہم آویز ہوا۔ متعدد و مختلف حکومتیں دیکھیں، حاکم و محکوم کے مراحل سے بھی گزرا، سطوت و جلالت کا بھی مظہر رہا اور نکبت و محرومی کی تلخیوں سے بھی آشنا ہوا۔ لیکن ہندوستان میں جن حالتوں کے ماتحت اس کو روز بد دیکھنا پڑا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل جداگانہ تھا۔ سلطنت مغلیہ کا زوال کسی بیرونی حکومت یا طاقت کے استیلا پر نہ تھا ہندوستان کی اسلامی حکومت کی آخری تاریخ آپ کو کسی کتب خانہ میں نہیں مل سکے گی۔ اس کا سارا دفتر آپ کو ان سینوں میں مل سکتا ہے جنھوں نے خون کے آنسوؤں سے تاریخ لکھی ہے اس کا پتا الفنسٹن یا لین پول یا اسمتھ کو نہیں ہے، یہ داستان درد تو آپ صرف حالی سے سن سکتے ہیں

اسلام دنیا کی ہر طاقت اور ہر آفت کا مقابلہ کر سکتا ہے الا مسلمانوں کا، اسلام ہر کلایو کا مقابلہ کر سکتا ہے، مگر کسی میر جعفر پر غالب نہیں آسکتا۔ یہاں ایک اکبر سیکڑوں اورنگ زیبوں کو زیر و زبر کر سکتا ہے۔ اوہام پرستی، خود غرضی، مصلحت اندیشی اور عافیت جوئی ایسی چیزیں تھیں جنھوں نے تقریباً ہر مسلمان کو اسلام کا دشمن بنا دیا، ایک ہی اسلام آئین اکبری اور فتاوی عالمگیری تصنیف نہیں کر سکتا تھا، ہندوستان کے مسلمانوں نے اس سبق کو بھلا دیا جس کو اب تک انھوں نے کسی سخت سے سخت

ابتلا میں بھی نہیں بھلایا تھا۔ انھوں نے نامساعد حالت اور زمانہ کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ خود اسلام کو ان سے ممزوج کرنا چاہا۔ وہ گرد وپیش کے واقعات کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے حالانکہ اسلام دنیا کے سامنے صرف اسلام کی صورت میں پیش کیا جاسکتا تھا، یہاں کوئی مفاہمہ نہیں کیا جاسکتا تھا، ممکن ہے بعض مذاہب بین دین کے اصول پر قائم ہوں یا قائم کئے جائیں، لیکن اسلام یا تو اسلام ہے یا پھر کچھ نہیں۔ مغربی زندگی جس کا ایک دھندلا سا خاکہ اس سے قبل پیش کیا جاچکا ہے، اسلام کے منافی ہے مغرب کی نظر صرف حیات پر ہے، اسلام حیات کو ممات کا صرف ایک مرحلہ قرار دیتا ہے۔ مغرب یہ دیکھتا ہے (اور اس کا طلب گار ہے) کہ آپ حیات پر موت کو قربان کرسکتے ہیں یا نہیں، مسلمان کو اس کی فکر ہے کہ موت پر حیات قربان کرنی ضرور ہے۔ مغرب اس بات کا کوشاں ہے کہ دنیا کی ہر راحت خواہ وہ کسی طور پر حاصل کی گئی ہو کس طور پر اپنے لئے مخصوص اور محفوظ کی جاسکتی ہے، اسلام کو اس کی فکر دامن گیر ہے کہ اپنے اوپر تکلیف اُٹھا کر کس طرح دوسروں کو راحت پہنچائی جاسکتی ہے۔

یہ ایک نہایت سطحی اور ایک حد تک نامکمل نقشہ تھا اس اسلام کا جو آج تیرہ سو برس ہوئے ہم پر نازل ہوا تھا اور اس

اسلام کا جو ہمارے ہاتوں مسخ ہوا اور جس کے ساتھ ہم خود بھی مسخ ہو گئے۔ ممکن ہے اقبالؔ نے یورپ کا سفر نہایت آرزو اور اشتیاق کے ساتھ کیا ہو ممکن ہے ان کو امید رہی ہو کہ گوہر مقصود وہاں ہاتھ لگ جائے گا لیکن میرے نزدیک تو ان کی حالت

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

کی مصداق رہی اور ان کو بالآخر "سوئے حجاز" عناں تاب" ہونا پڑا ان حالات کے ماتحت اسرارِ خودی اور رموز بیخودی عالم وجود میں آئیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ان کی تعلیمات پر ایک نظر ڈالیں

اقبالؔ کا مطالعہ کرنے سے قبل چند ابتدائی رموز ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔ کیوں کہ یہ ان کی تعلیم کے بنیادی اصول ہیں جن کا مختلف اوقات میں مختلف انداز سے اعادہ کیا گیا ہے۔

(۱) اقبالؔ کلیتہً اسلامی شاعر ہیں اور ان کی تعلیم کی بنیاد تمامتر دین متین کے ارکان اساسی پر ہے۔

۲۔ اقبالؔ کے نزدیک حیات انسانی کی اولین کامیابی خودی یا انانیت پر ہے یعنی افراد کا اپنی اس استعداد اور قوت کو محسوس اور مکمل کر لینا اور ان پر بہمہ وجوہ قادر ہونا جس کا اشارہ قرآن پاک میں اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ انسان مکمل یا "سوپر مین" کا فلسفہ اسی راز میں مضمر ہے۔

(۳) ایسی مکمل اور جامع ہستیوں کا ایک نظام ملی۔
(۴) اقبال اپنے خیالات اور تعلیمات کے اعتبار سے "بیرومی" کے سپاس گزار ہیں۔
(۵) اقبال کے نزدیک اس آشوب گاہ حیات میں اگر کوئی مذہب یا تعلیم یا عمل کامیاب رہ سکتا ہے تو وہ ملت اسلامیہ ہے جو مجموعہ یا نتیجہ ہے مکمل شخصیتوں اور مکمل نظام جمعیت کا۔

یہ ایک سرسری تلخیص ہے اقبال کے اس پیغام کی جس کو انھوں نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اسرار خودی اور رموز بیخودی میں پیش کیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کو کس طور پر ترتیب دیا ہے اور اپنے ادعا کا کیا ثبوت پیش کیا ہے۔

دعویٰ یہ ہے کہ نظام عالم کی بنیاد خودی پر ہے اور ہر وجود کا تعین اسی نسبت سے ہے جس نسبت سے اس کی خودی کو استحکام و استواری ہے۔ ہر چیز کا مدار اور تعین اس چیز کے مستقل وجود سے ہے جس وقت وہ چیز اپنے وجود سے غافل ہوئی اس پر ایک دوسری حقیقت یا تعین حقیقت کا اطلاق ہو گیا۔ اس طور پر تعین وجود استحکام وجود پر منحصر ہے، استحکام کا نہ رہنا اس چیز کو تعلق تعین سے محروم کر دیتا ہے اور جب تعین باقی نہ رہا تو وجود کا تخیل معدوم ہو گیا، اس راز کو اقبال نے چند مثالوں سے واضح کیا ہے۔

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی ست
پس بقدرِ استواری زندگی ست

کوہ چوں از خود رود دریا شود
شکوہ سنج جوشش دریا شود

موج تا موج ست در آغوشِ بحر
می کند خود را سوارِ دوشِ بحر

گر بفطرت پختہ تر بودے نگیں
از جراحت ہا بیاسودے نگیں

یہاں تک تو خودی کے کرشمے تھے، اب بتانا یہ ہے کہ خودی اپنی حیات اور وجود کے لئے کس کی رہینِ منت ہے اقبال کا فیصلہ یہ ہے کہ:

حیات خودی از تخلیق و تولید مقاصد ست

ہر حیات کا مدار ایک دوسری حیات پر ہے یا یوں کہئے تعین "حرکت" پر ہے، اس طور پر حیات فی نفسہ حرکت شعوری یا نوعی پر ہے۔ خودی کو بیدار کرنے والی چیز تحریک مقاصد ہے اور ہر زندگی کا مدار کسی نہ کسی مقصد پر ہے جسے اقبال نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

زندگانی را بقا از مدعاست
کاروانش را درا از مدعاست

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو ہنگامہ آرائے خودی
موجِ بیتابی ز دریائے خودی

زندہ را نفیِ تمنا مردہ کرد
شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد

ہر شے کے وجود کا اطلاق اُس شے کے تعین خودی پر ہے

یعنی جب تک اس شئے میں اپنی خودی کو برقرار رکھنے کی آرزو موجود ہے اس شئے کا وجود متعین ہے اس طور پر آرزو کا مفہوم احساس حیات یا آرزوئے حیات ہوگا۔ اقبالؔ نے خودی کی بنیاد استحکام عشق و محبت پر رکھی ہے اور وجود مسلم کے لئے جس آرزو (یا عشق و محبت) کو مخصوص کیا ہے وہ ولائے مصطفویؐ ہے، اور یہاں پہنچکر اقبالؔ نے نفس مطلب کی طرف گریز کی ہے۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ ست ... آبروے ما ز نام مصطفیٰؐ ست
در شبستانِ حرا خلوت گزید ... قوم و آئین و حکومت آفرید
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش ... تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم ... تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
سرِ مکنونِ دلِ او ما بدیم ... نعرہ بے باکانہ زد افشا شدیم

اقبالؔ نے دستِ سوال کو خودی کا منافی قرار دیا ہے، ظاہر ہے جب نفس کو اپنے اوپر اعتماد نہ رہا تو پھر اس میں خودداری کہاں باقی رہی، فرماتے ہیں ؎

از سوال آشفتہ اجزائے خودی ... بے تجلی نخلِ سینائے خودی
ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز ... آبروئے ملتِ بیضا مریز
فطرتے کو بر فلک بندد نظر ... پست می گردد ز احسانِ دگر

جس وقت خودی کی عشق و محبت سے تخمیر ہو چکی ہے، نظام

عالم زیرنگیں آجاتا ہے۔ اس عالم میں پہنچکر انسان ماسوا سے بے نیاز اور بے خطر ہو جاتا ہے۔ یہاں اقبالؔ نے ایک واقعہ نظم کیا ہے، حضرت شیخ بو علی قلندر کا ایک مرید اپنے خیالات میں غرق راستہ سے گزر رہا تھا، عامل شہر کی سواری آرہی تھی، چوبدار نے راستہ سے علیحدہ ہو جانے کی تنبیہ کی، درویش کو خبر نہ ہوئی، چوبدار نے ایک ضرب رسید کی، مرید شیخ سے فریادی ہوا، شیخ پر جو حالت طاری ہوئی اور اس کا جو انجام ہوا اقبالؔ نے اس کا خاکہ یوں پیش کیا ہے۔

صورتِ برقے کہ بر کہسار ریخت | شیخ سیل آتش از گفتار ریخت
از رگِ جاں آتش دیگر کشود | با دبیرے خویش ارشادے نمود
خامہ را برگیر و فرمانے نویس | از فقیرے سوئے سلطانے نویس
بندہ ام را عاملت بر سر زدہ است | بر متاعِ جانِ خود اخگر زدہ است
باز گیر ایں عامل بد گوہرے | ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے
نامۂ آں بندۂ حق دستگاہ | لرزہا انداخت در اندامِ شاہ
پیکرش سرمایۂ آلام گشت | زرد مثلِ آفتابِ شام گشت
بہرِ عامل حلقۂ زنجیر جست | از قلندر عفوِ ایں تقصیر جست

علامہ اقبالؔ نے اس ضمن میں کہ نفی خودی اقوام مغلوبہ کا شیوہ ہے ایک حکایت لکھی ہے۔ ایک بار گوسفندوں کی چراگاہ

میں شیروں کی کچھ تعداد آگئی۔ جس کی وجہ سے سارا مرغزار گوسفندوں کے خون سے رنگین ہوگیا۔ ایک باراں دیدہ گوسفند نے شیروں کو وعظ کہنا شروع کیا، جس کا لب لباب یہ ہے؎

ہر کہ باشد تند و زور آور شقی ست	زندگی مستحکم از نفی خودی ست
روح نیکاں از علف یابد غذا	تارک اللحم ست مقبول خدا
جستجوئے عظمت و سطوت شر ست	تنگدستی از امارت خوشتر ست
برق سوزاں در کمین دانہ نیست	دانہ گر خرمن شود فرزانہ نیست

شیروں کو یہ نصیحت پسند آئی، انھوں نے گوسفندوں کا دین اختیار کر لیا۔ جس کا انجام یہ ہوا؎

آں جنونِ کوشش کامل نماند	آں تقاضائے عمل در دل نماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت	اعتبار عزت و اقبال رفت
پنجہ ہائے آہنی بے زور شد	مردہ شد دلہا و تنہا گور شد
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی	کوتہ دستی بے دلی دوں فطرتی
شیر بیدار از فسونِ میش خفت	انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

یہاں تک تو نفس خودی سے بحث تھی جس میں ضمناً چند اور مباحث آگئے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس خودی کی تربیت کس طور پر ہوتی ہے اور اقبال کا نظریہ اس کے متعلق کیا ہے؟ اقبال نے تکمیلی تربیت کے لئے تین مراحل پیش کئے ہیں۔ ایک اطاعت

دوسرے ضبط نفس، تیسرے نیابت الٰہی۔

اطاعت کا مفہوم یہ ہے کہ آئین معینہ کی پابندی کی جائے ہر انسان بحیثیت انسان کے چند فرائض کا پابند ہے اور یہ کچھ انسان ہی پر موقوف نہیں ہے۔ ہر شے اپنے وجود کے اعتبار سے چند اوامر اور نواہی کی پابند ہے بصورت دیگر وہ شے اپنے خصائص سے محروم اور اطلاق تعین سے عاری ہے جس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وجود سے بے بہرہ ہے انہی پابندیوں سے جو بمنزلہ فرائض کے اس پر عائد ہوتے ہیں بوجوہ احسن عہدہ برآ ہونا منشار فطرت کا پورا کرنا ہوتا ہے۔

انسان شرف انسانیت سے اسی وقت متصف ہو سکتا ہے جب وہ اُن تمام پابندیوں سے عہدہ برآ ہو جائے جو اس کی شرف انسانیت کے ساتھ لازم قرار دی گئی ہیں۔ جب تک وہ ان کو اتمام کو نہ پہونچالے وہ کلیتہً آزاد نہیں تصور کیا جا سکتا اس لئے تکمیل خودی میں اولین فرض یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنی خلقت اور مقصد خلقت کے اعتبار سے جس آئین کا حامل قرار دیا گیا ہے بلحاظ اوامر اور نواہی اس کی اطاعت کا پابند ہو اطاعت کے مسئلہ میں اقبال نے اونٹ کی مثال پیش کی ہے۔ جس پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جو صفات

اس کی خصوصیات میں داخل ہیں وہی بالآخر منزل رساں ثابت ہوتی ہیں ؎

خدمت و محنت شعارِ اشترست
صبر و استقلال کار اشترست

گام او در راہ کم غوغاستے
کارواں را زورق صحراستے

نقش پایش قسمتِ ہر بیشۂ
کم خور و کم خواب و محنت پیشۂ

مستِ زیرِ بارِ محمل می رود
پائے کوباں سوے منزل می رود

سرخوش از کیفیتِ رفتار خویش!
در سفر صابرتر از اسوار خویش

ہر کہ تسخیرِ مہ و پرویں کند
خویش را از بجریٔ آئیں کند

می زند اختر سوئے منزل قدم
پیش آئینے سرِ تسلیم خم

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو
از حدودِ مصطفٰے بیروں مشو

تعمیر و تکمیل خودی میں دوسرا مرحلہ ضبط نفس کا ہے ضبطِ نفس نام ہے اس قدرت کا جو نفس کی ان کمزوریوں یا غلبہ زائیوں پر عبور حاصل کرتے ہیں۔ بروئے کار لانا پڑتا ہے جو تعمیل فرائض میں مانع آتی ہیں۔ انسان کا ماسولے سے مرعوب ہونا محض اس بنا پر ہے کہ وہ نفس کی خواہشوں کا پابند ہے۔ فی الحقیقت انسان کسی دنیاوی قوت سے نہیں ڈرتا الا ایسی حالت میں جب

اس کے نفس کی خواہشات معرض خطر میں ہوں۔ نظر براں یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ ڈر اپنی خواہشات نفس کے نہ پورے ہونے کا ہوتا ہے اور چونکہ خواہشات اپنے تنوعات کے اعتبار سے گوناگوں ہوتی ہیں، انسان ہر ہر قدم پر خائف اور متزلزل رہتا ہے اور اس کے مسجود کی تعداد ہمیشہ ترقی پر رہتی ہے۔ اگر ڈرنا اور جھکنا انسان کی فطرت میں داخل ہے تو اس کے ازالہ کی بہترین عملی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ صرف کسی ایک ہستی سے خائف ہو جس کی قدرت قہر و مہر کو وہ بہت زیادہ مہیب یا مستحسن تصور کرتا ہو۔ اس طور پر وہ چھوٹے چھوٹے خطرات اور اندیشہ ناکیوں سے آزاد ہو جائے گا اس مختصر بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انسان کو ضبطِ نفس پر قادر ہونا چاہیے ورنہ اپنی خواہشات نفس کے اعتبار سے وہ ہمیشہ دوسری شخصیتوں سے مرعوب ہوتا رہے گا اور اس طور پر اس کی خودی کی تعمیر یا تکمیل نہ ہو سکے گی۔ اقبال نے اس کا نہایت واضح خاکہ یوں پیش کیا ہے۔

طرحِ تعمیرِ تو از گل ریختند — با محبت خوف را آمیختند
خوفِ دنیا، خوفِ عقبیٰ، خوفِ جاں — خوفِ آلامِ زمین و آسماں
حبِ مال و دولت و حبِ وطن — حبِ خویش و اقربا و فرزند و زن

تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش — خم نہ گردد پیشِ باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست — خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد — فارغ از بندِ زن و اولاد شد

اس سلسلہ میں اقبال نے ارکانِ شریعت کے عقلی اور فلسفیانہ نکات پر بھی نظر ڈالی ہے ؎

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز — قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر ست — قاتلِ فحشا و بغی و منکر ست
روزہ بر جوع و عطش شب خوں زند — خیبرِ تن پروری را بشکند
مومناں را فطرت افروز ست حج — ہجرت آموز و وطن سوز ست حج
حبِ دولت را فنا سازد زکوٰۃ — ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ
دل ز حتیٰ تنفقوا محکم کند — زر فزاید الفت زر کم کند
ایں ہمہ اسباب استحکام تست — پختۂ محکم اگر اسلام تست

اطاعت اور ضبطِ نفس کے بعد تعمیر کے مراحل ختم ہو جاتے ہیں اور ان دونوں صفات کا نتیجہ صریح، منزل مقصود نیابت الٰہی، پر ختم ہو جاتا ہے۔ نیابت الٰہی فی الحقیقت انی جاعل فی الارض خلیفہ کی تشکیل و تعمیر ہے۔ یعنی انسان اپنے وجود میں ان تمام صفات کو پیدا یا بالیدہ کرلے جو امانت

خداوندی سے بہ وجوہ احسن عہدہ برآ ہونے میں لازم آتے ہوں
نیابت الٰہی کا مسئلہ الٰہیات اسلامی میں خاص درجہ رکھتا ہے۔
اس کا راز صرف اس حقیقت میں مضمر ہے کہ انسان اشرف المخلوقات
ہے۔ اس مسئلہ کا حل عملاً اتنا آسان نہیں ہے جتنا یہ بظاہر معلوم
ہوتا ہے۔ اشرف المخلوقات کا مفہوم یہ ہے کہ انسان صانع حقیقی
کے علم، قدرت اور حکمت کا اختراع فائقہ ہے۔ اس شئے باعتبار
اس نسبت کے جو مصنوع کو صانع سے ہے یہ ماننا پڑے گا کہ مصنوع
میں صانع کی روح صنعت گری پوشیدہ ہے اور یہ روح مصنوع
میں جس درجہ کی ہوگی اسی اعتبار سے وہ صانع کے قریب تر ہوگی
یا اس میں قریب تر ہونے کی صلاحیت ہوگی۔ اس نظریہ کے ماتحت
صانع ازل کا یہ نمونہ صنعت جس کو اشرف المخلوقات تسلیم کیا گیا ہے
اپنی استعداد قدرت کے اعتبار سے موجودات عالم پر اتنا ہی قادر
اور حاوی ہو سکتا ہے جتنا اس میں استعدادات الٰہیہ کے حامل ہونے
کی گنجائش رکھی گئی ہے اور جتنا وہ اس استعداد کو قوانین معینہ کے
ماتحت بالیدہ اور مستحکم کر سکتا ہے۔ نیابت الٰہی اسی حقیقت کی ترجمان
ہے جس کی تشریح اور تفصیل اقبالؔ نے ان الفاظ میں پیش کی ہے ؎

نائبِ حق در جہاں بودن خوش ست — بر عناصر حکمراں بودن خوش ست
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم ست — ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم ست

از رموزِ جزو و کل آگہ بود | دو جہاں قائم بامر اللہ بود
نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر | ہم سپاہی ہم سپہگر ہم امیر
مدعائے عَلَّمَ الْاَسْمَا ستی | سرِ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْریٰ ستی
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم ست | از جلالِ او نجاتِ عالم ست

اسی نیابتِ الہیٰ کے لئے اقبالؔ کے نزدیک یہ سارا آشوب گاہِ حیات چشم براہ ہے اور اقبالؔ نے اسی "مکمل انسان" کی پذیرائی کی ہے:

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا | اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامہ ایجاد شو | در سوادِ دیدہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن | نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ | جامِ صہبائے محبت باز دہ
باز در عالم بیار ایامِ صلح | جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح
نوعِ انساں مزرعِ تو حاصلے | کاروانِ زندگی را منزلے

اقبالؔ کا یہی "انسانِ کامل"[۱] ناقدین اور حکمائے یورپ کی طبع آزمائی کا نہایت معرکۃ الآرا موضوع ہے۔ ابھی ناظرین نے

---

[۱] اقبالؔ نے اس موضوع پر آج سے پچیس[۲۵] سال پہلے ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ انڈین اینٹی کیری (بمبئی) میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا ماخذ مشہور اسلامی صوفی و فلسفی عبد الکریم الجیلی کی کتاب موسوم بہ انسان الکامل تھی۔

غالباً گزشتہ تفصیل کو نظر انداز نہ کیا ہوگا جس میں اقبالؔ اور نیٹشے کے "انسان کامل" اور "سوپرمین" پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔ ڈکنس کے اس خیال کی تردید کہ مثنوی زیر بحث میں مادی قوت کو معبودیت کے درجہ پر رکھا گیا ہے، خود اقبال نے کی ہے اور اب تک اقبالؔ کے کلام پر جہاں تک بحث کی جاچکی ہے ناظرین خود اس فیصلہ پر پہنچنے کیلئے آمادہ ہوں گے کہ اقبالؔ نے اپنے "انسان کامل" میں ایک ایسی زندہ شخصیت کو پیش کیا ہے جو ہمارے مسائل معاشرت کو حل کرے، ہماری خصومات کا فیصلہ کرے اور بین الاقوامی اخلاق کو ایک محکم تر بنیاد پر قائم کرے۔ یہاں پہنچکر یہ سوال بھی اٹھایا جاسکتا ہے کہ جس "مکمل انسان" کا خاکہ اقبالؔ نے پیش کیا ہے وہ (اسلامی نقطۂ نظر سے) آنے والا ہے یا آچکا ہے۔ یہ مسئلہ جتنا معرکتہ الآرا ہے اتنا ہی پیچیدہ اور نازک بھی ہے۔ اسلام کی گزشتہ تاریخ اس مکمل انسان کے مسئلہ کو ایسی روشنی میں بھی پیش کرسکتی ہے جہاں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی لیکن جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے۔ اقبالؔ کا "مکمل انسان" اسلام کے اس مکمل انسان سے مختلف ہے بلکہ اس کے علاوہ ہے جس کا ایک مسلمان قائل ہے اقبالؔ کے مکمل انسان کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ جامع حیثیات ہو۔ زندگی اور معاشرت کے مختلف اور متعدد شعبوں کے مختلف

مکمل انسان" ہوسکتے ہیں۔ اس محدود معنی میں مصطفےٰ کمال، گوئٹے، مہاتما گاندھی، حکیم اٹن اٹائن وغیرہ وغیرہ آسکتے ہیں یہاں پر میں ایک دلچسپ نکتہ کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں جو میرے ایک سوال پر علامہ سر اقبال نے خود بیان فرمایا تھا یعنی اگر کسی وقت ایک ہی مقام پر دو "مکمل انسان" (سوپرمین) اکھٹے ہوجائیں تو کیا ہو، ممدوح نے فرمایا کہ تقدیر الہی کا منشا یہ ہے کہ دو سوپرمین ایک جا جمع نہ ہوسکیں، اگر کبھی ایسا ہوتا ہے تو دونوں غیر مطمئن ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے راہ ہو لیتا ہے۔ مثال میں ممدوح نے جناب رسالت مآبؐ اور حضرت اویس قرنیؓ کا واقعہ پیش کیا کہ یہ دونوں ہستیاں باوجود اشتیاقِ دید یک جا نہ ہوسکیں، دوسری مثال نپولین اور گوئٹے کی دی جو ملنے پر بھی ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہ ہوسکے یہاں تک کہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے!

یورپ کے بعض ناقدین کا یہ اعتراض ہے:۔

"اقبال کہتے ہیں خودی کو خدا میں جذب نہ ہونا چاہیئے لیکن اسے گول کر جاتے ہیں کہ اگر وہ جذب ہونا چاہیئے تو ہوسکتی بھی ہے یا نہیں، ہندوؤں کے لٹھاںڈ کا خوف ان پر برابر طاری ہے"

اس بحث پر اس پہلو سے نظر ڈالنی چاہیئے کہ خدا اور خودی

میں فرق ہے اور جب تک ان کے وجود کا تعین بحیثیت خدا اور خودی کے ہے دونوں کا انضمام ناممکن ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت یوں بھی ہوسکتی ہے کہ خدا کی ایک صفت منزہ ہونا بھی ہے انسان خواہ وہ مکمل انسان ہی کیوں نہ ہو اپنی حیثیات انسانی سے منزہ نہیں ہوسکتا۔ ذات باری سے قریب ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ذات باری میں جذب بھی ہوسکتا ہے یا ذات باری میں ضم ہو جانے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ترقی کے راستہ میں ایک مرحلہ ایسا بھی آئے گا جس سے جب تک اس پر انسانیت کا اطلاق ہے وہ آگے نہ بڑھ سکے گا۔ ترقی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ غیر محدود ہو۔ اسلامی الٰہیات میں خدا کی ذات وصفات دو مختلف چیزیں رکھی گئی ہیں۔ صوفیائے کرام کے نزدیک یہ عالم اور اس کی موجودات فی حد ذاتہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ یہ محض تعینات وشئونات ہیں اور اسی بنا پر اس کو عالم اعتبار کہا جاتا ہے اور چونکہ ان کی ہستی محض اعراضی ہے اس لئے ان کو بقا نہیں ہے۔ اس عقیدہ کے ماتحت انسان کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن اقبال کا مسلک کسی حد تک اس سے بالکل جداگانہ ہے وہ خدا اور انسان دونوں کو مختلف شخصیتیں یا ذات قرار دیتے ہیں اور اس عقیدہ کے رو سے دونوں

کا انضمام ناممکن ہو جاتا ہے۔ بہر حال انضمام اس نظریہ کے ماتحت بھی ناممکن ہو جاتا ہے کہ غیر محدود محدود میں کبھی شامل نہیں ہو سکتا، اقبال کو ہندوؤں کے عقیدہ کا یوں بھی کبھی خطرہ نہیں ہو سکتا کہ اسلام میں انسانیت اور الوہیت دو مختلف چیزیں ہیں جو جنس مختلف ہونے کی حیثیت سے کبھی ایک دوسرے میں جذب نہیں ہو سکتیں۔

اقبال کی تعلیم سعی و عمل کی ہے، عمل کو انھوں نے انسان کی ساری دقتوں اور زحمتوں کا تنہا علاج بتایا ہے اور یہ تعلیم جتنی مؤثر ہے اتنی ہی قرین قیاس بھی ہے اگر کوئی چیز تکلیف دہ یا دقت طلب معلوم ہوتی ہے تو اس کا صرف یہ علاج ہے کہ اس کے ازالہ میں پوری استعداد اور قوت کو بر سر کار لایا جائے۔ فی الاصل کوئی وقت دقت نہیں ہوتی بلکہ یہ ہماری راحت طلبی اور سہل انگاری ہے جو اس کو مشکل بنا دیتی ہے۔ ہر شخص اگر اپنی ضرورت یا دقت کا تجزیہ کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ دقت کا ذمہ دار وہ خود ہے کیونکہ اس کی ضرورت یا دشواری جس استعداد قوت و عمل کی مقتضی ہے وہ اس کو کار فرما بنانے سے جی چراتا ہے اقبال نے اس نکتہ کو نہایت دل کش پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

خیز و خلاق جہاں تازہ شو   شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو

با جہانِ نامساعد ساختن | ہست در میداں سپر انداختن
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار | با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں | می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را | می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند | چرخِ نیلی فام را برہم زند
آزماید صاحبِ قلبِ سلیم | زورِ خود را از مہماتِ عظیم
ممکناتِ قوتِ مردانِ کار | گردد از مشکل پسندی آشکار
زندگانی قوتِ پیدا ستی | اصلِ او از ذوقِ استیلا ستی
اے ز آدابِ امانت بے خبر | از دو عالم خویش را بہتر شمر

اسرارِ خودی میں اقبال نے شیخ و برہمن کی ایک حکایت اور گنگا و ہمالہ کا ایک مکالمہ دیا ہے جس میں اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ حیاتِ ملی کا مدار روایاتِ مخصوصہ ملیہ کی پابندی سے ہے۔ یہ گویا رموزِ بیخودی کی طرف گریز ہے جس میں حیاتِ اجتماعیہ کے اصول و قوانین پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اب تک انفرادی اور شخصی تعمیر و تشکیل پر زور دیا گیا تھا لیکن ہر انفرادی زندگی جماعت سے بھی ایک اہم نسبت رکھتی ہے جس کی بحث نہایت شرح و بسط کے ساتھ رموزِ بیخودی میں کی گئی ہے۔ حکایت مذکورہ بالا میں شیخ نے برہمن کی داستانِ ناکامی سنکر یہ تلقین کی ہے

من نہ گویم از بتاں بیزار شو
کافرے شائستہ زنار شو
اے امانت دار تہذیبِ کہن
پشت پا بر مسلکِ آبا مزن
گر ز جمعیت حیات ملت ست
کفر ہم سرمایۂ جمعیت ست

اقبال نے آئین مخصوصہ اور متعلقہ کی پابندی پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ اس لئے برہمن کے لئے بھی لازم قرار دیا ہے کہ وہ "تہذیبِ کہن" کے بارِ امانت سے اپنے آپ کو کبھی سبک دوش نہ تصور کرے۔ ہر زندگی کسی نہ کسی اصول یا عقیدہ پر مبنی ہے اس لئے جب تک کسی مخصوص ملت پر قائم رہنا منظور ہو اس وقت تک اس کو آئین اور روایات کا پابند ہونا چاہیئے۔

ایک دوسرے مقام پر دریا نے پہاڑ کو طعنہ دیا ہے ؎

حق ترا با آسماں ہمراز ساخت
پات محرومِ خرامِ ناز ساخت
طاقتِ رفتار از پایت ربود
ایں وقار و رفعت و تمکین چہ سود
زندگانی از خرامِ پیہم ست
برگ و سازِ ہستیِ موج از رم ست

پہاڑ نے اس طنز کا یہ جواب دیا ؎

گفت اے پہنائے تو آئینہ ام
چوں تو صد دریا درونِ سینہ ام
ایں خرامِ ناز سامانِ فناست
ہر کہ از خود رفت شایانِ فناست
از مقامِ خود نہ داری آگہی
بر زبانِ خویش نازی ابلہی
ہستیِ خود نذرِ قلزم ساختی
پیشِ رہزن نقدِ جاں انداختی

قرنہا بگزشت و من پا در گلم | تو گماں داری کہ دُور از منزلم
ہستیم بالید تا گردوں رسید | زیرِ دامانم ثریا آرمید
ہستیِ تو بے نشاں در قلزم ست | ذروۂ من سجدہ گاہِ انجم ست
قطرۂ؟ خود را بپائے خود مریز | در تلاطم کوش و با قلزم ستیز

آخر مثنوی میں اقبال نے اس بحث کو چھیڑا ہے کہ ایک مسلم کی حیات اعلائے کلمۃ الحق کے لئے ہے اور ایسا جہاد جس کی بنیاد جوع الارض پر ہو اسلام میں حرام ہے۔ اب تک جن مباحث پر اقبال نے اظہار خیال کیا ہے ان کو ملحوظ رکھتے ہوتے ان مباحث کا یک بیک پیش نظر ہو جانا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت ان مباحث کو اس مقام سے ایک خاص ربط ہے۔

دنیا میں آج کل جو شور و فتن رونما ہے اس کے اسباب پر انھیں صفحات میں بحث کی جا چکی ہے۔ اس کشاکش کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انسان حتی الوسع دوسروں کے ثمرات محنت سے فائدہ اٹھانے پر مائل ہی نہیں بلکہ لبا اوقات دلیر بھی ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان اس کی بہت کم جرائت کرتا ہے کہ وہ اپنے یا دوسروں کی جاہ و دولت سے بے پروا یا بے خوف ہو کر حق پر قائم ہو جائے یا اس کا اعلان کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بالعموم ارتکاب

جرائم پر اپنے آپ کو جتنا دلیر سمجھتا ہے یا اس کو گوارا کرتا ہے اتنا اپنے آپ کو کارِ خیر پر نہ قادر سمجھتا ہے اور نہ اس کی ہمت کرتا ہے۔ جہاد کا وہ مفہوم نہ لینا چاہیئے جسے اغیار نے مسلمانوں کے خلاف شہرت دے رکھا ہے جہاد عبارت ہے انسان کی اُس جرأت عمل سے جو حق و صداقت کی تحفظ و تعمیم کے لئے اس میں فطرت نے ودیعت کی ہے جس سے وہ عہدہ برآ ہونے سے اکثر گریز کرتا ہے۔ ہر مسلمان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ بقدرِ استطاعت باطل کی تاراجی اور صداقت کی علمبرداری کیلئے اپنی انتہائی قوت صرف کردے۔" امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا فرمان اسی راز کا ترجمان ہے۔ یہاں پر ایک فاضل کا قول نقل کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔

"اسلام امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے آیا اور امر بالمعروف اور جہاد دونوں ایک ہی حکم کے دو نام ہیں۔ پس ہر وہ کوشش جو حق کے لئے ہو، ہر وہ صرفِ مال جو سچائی اور نیکی کی خاطر ہو، ہر محنت یا مشقت جو صداقت کے نام پر ہو، ہر وہ تکلیف و مصیبت جو اپنے جسم و جان پر راہِ حق میں برداشت کی جائے، ہر وہ قید خانہ کی زنجیر اور بیڑی جو اعلانِ حق کی وجہ سے پاؤں میں پڑے

ہر وہ پھانسی کا تختہ جس پر جمالِ حق و صداقت کا عشق لے جاکر

کھڑا کر دے، غرض کہ ہر قربانی جو بذریعہ جان و مال، اور زبان

وقلم، سچائی اور حق کی راہ میں کی جائے جہاد فی سبیل اللہ ہے

...... اور مقام امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں داخل ہے"

اسلام ناحق کوشی کا دشمن ہے۔ اس لئے اس کی شریعت میں ہر وہ کوشش حرام ہے جو حقیقت کے راستہ سے دور ہو اقبال کا یہ قول ان کی ساری تفصیل پر آخری لفظ ہے ؎

صلح شر گردد چو مقصود ست غیر | گر خدا باشد غرض جنگ ست خیر
گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند | جنگ باشد قوم را نا ارجمند
ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید | تیغ او در سینۂ او آرمید

آخر میں اقبال نے تدابیر اور اسباب کو بھی خیرباد کہدیا ہے اور اس بڑی ہستی کو پکارا ہے جس کے اشارہ بغیر یہ ساری داستانِ رستخیز محض بے معنی رہ جاتی ہے اقبال نے ایک ہمنوا، ایک ہمدم اور ایک ہمراز کے لئے یوں مناجات کی ہے ؎

من مثالِ لالۂ صحراستم | درمیانِ محفلے تنہاستم
خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے | از رموزِ فطرتِ من محرمے
ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ | از خیالِ این و آں بیگانۂ
تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش | باز بینم در دلِ او روئے خویش

سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش
هم صنم او را شوم هم آذرش

رموزِ بیخودی

اسرار خودی میں اقبالؔ کو افراد اور شخصیتوں کے متعلق جو کچھ تعلیم دینی تھی یا اس ضمن میں میری عقل و فکر نے جہاں تک میری رہبری کی میں نے ان تعلیمات کا ایک نامکمل سا خاکہ پیش کر دیا ہے لیکن جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ہر چیز ایک نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔ ہماری زندگی فی الحقیقت علائق اور نسبتوں کی ایک نامتناہی زنجیر ہے جزو کل کا ربط ناگزیر ہے۔ وہ ہر چیز جسے ہم انسانی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تعینات مخصوصہ کا نام ہے اور تعین کا وجود تسلسل سے ہے افراد کا جماعت سے تعلق ہوتا ہے جزو کی بحث ہو چکی۔ اب کل کے ساتھ اس کی نسبتوں پر نظر ڈالنی لازم آتی ہے۔ اقبالؔ نے اس کا اعادہ ان الفاظ میں کیا ہے ؎

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند — سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
فرد تنہا از مقاصد غافل ست — قوتش آشفتگی را مائل ست

ملت کا قیام اختلاط افراد پر ہے اور اس کی تعمیر و تکمیل نبوت

سے ہوتی ہے ۔ جماعت کا حقیقی مفہوم نفس نبوت کا ترجمان ہے ہر شے خواہ وہ افراد سے متعلق ہو یا جماعت سے جب تک کوئی زندہ عقیدہ یا قانون اسے مربوط یا مستحکم نہ کرے ربط کا کوئی حقیقی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔

تا خدا صاحبدلے پیدا کند | کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پردازے کہ از آوازۂ | خاک را بخشد حیاتِ تازۂ
زندہ از یک دم دو صد پیکر کند | محفلے رنگیں ز یک ساغر کند
بند ہا از پا کشاید بندہ را | از خداوندان رہاید بندہ را
گویدش تو بندۂ دیگر نۂ | زیں بتانِ بے زباں کمتر نۂ
تا سوئے یک مدعائش می کشد | حلقۂ آئیں بپائش می کشد

ایک اسلامی شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کے نزدیک اس عالم کی حقیقی نجات بالفاظ دیگر معاشرت کے تمام شعبہ جات کی کامیابی و کامرانی اسلامی اصول کی پابندی اور ان کے نفاذ سے والبتہ ہے ۔ شاعری کا براہِ راست کام یہ ہے کہ وہ جذبات کو متاثر کرے اور ایک مذہب پرست کا شیوہ مذہبی عقاید کی ترویج و تلقین ہے وہ بھی اس طور پر کہ وہ اپنے کو محض عقائد کی حیثیت سے تسلیم کرائے ۔ ان نظریات کو ملحوظ رکھکر اقبال کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت محسوس ہوتی ہے کہ وہ باوجود شاعر اور

مذہب پرست ہونے کے انسانی ذہن و فکر کے میلاناتِ طبعی کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے، وہ ارکانِ اسلامی کی صداقت اور ہمہ گیری پر زور دیتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ خود مسلمان ہیں بلکہ محض اس بنا پر کہ انسانی ذہن و فکر کا اسلام سے انحراف کرنا ناممکنات سے ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اپنے شعر و شاعری میں الفاظ اور ترکیبیں تو ضرور شاعرانہ رکھتے ہیں لیکن بحث و استدلال ایک فاضل حکیم کے انداز سے کرتے ہیں۔ اسلام کے ارکان اساسی میں توحید، رسالت، نماز، روزہ، حج و زکواۃ کو مخصوص حیثیت حاصل ہے، آخرالذکر چار فرائض ایسے ہیں جو عمل سے متعلق ہیں، اقبالؔ نے ان کے فلسفہ پر خیالات ظاہر کئے ہیں لیکن پہلے دو حقیقتوں یعنی توحید اور رسالت پر رموز بیخودی میں نہایت شرح و بسط سے بحث کی ہے، توحید اور رسالت کا تعلق چونکہ معتقدات سے ہے اور یہیں سے دوسرے شعبہ جات کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس لئے اقبالؔ نے ان پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی ہے، کیونکہ توحید اور رسالت کو دیگر ارکان اسلامی سے وہی تعلق ہے جو بقیہ دفعات قانونی کو تمہید یا "پری ایمبل" سے ہوتی ہے فرماتے ہیں ؎

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر ست   در اٰتِی الرَّحمٰنِ عَبدًا مضمر ست

دیں از و حکمت از و آئیں از و
زور از و قوت از و تمکیں از و

اسود از توحید احمر می شود
خویش فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

ملت از یک رنگیٔ دلہاستی
روشن از جلوہ ایں سیناستی

قوم را اندیشہا باید یکے
در ضمیرش مدعا باید یکے

جذبہ باید در سرشتِ او یکے
ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے

گر نباشد سوزِ حق در سازِ فکر
نیست ممکن ایں چنیں اندازِ فکر

مدعائے ما مآل ما یکے ست
طرز و انداز خیال ما یکے ست

توحید ہی وہ حقیقت ہے جو انسان کو ان مکروہات سے محفوظ و مصئون رکھتی ہے جن میں اسیر ہو کر وہ زندگی کو پُر آشوب تصور کرنے لگتا ہے۔ مایوس، محزوں یا مخوف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو انسان کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے یا پھر وہ کسی ایسے حکیم و قادر کا قائل نہیں ہے جو نہ کبھی غلطی کرتا ہے اور نہ کبھی ظلم گوارا رکھتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے گی کہ خود اعتمادی کا اصلی راز بھی اسی عقیدہ توحید میں مضمر ہے، ہم کو اپنے اوپر اس لئے نہیں اعتماد ہے کہ ہماری قوت وحکومت کے ذرائع و وسائل نامحدود ہیں بلکہ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ جہاں سے ہم قوت و قدرت حاصل کرتے ہیں وہ ایک ایسی ہستی اور حقیقت ہے جو کبھی غلطی یا زیادتی نہیں کرتی۔ اس لئے

جب تک ہم اس حقیقت یا ہستی کی پیروی کرینگے ناکامیاب نہیں رہ سکتے۔ اقبال نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ؎

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزوست | زندگانی محکم از لاتقنطواست
اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر | از نبی تعلیمِ لاتحزن بگیر
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود | قلبِ او از لاتخف محکم شود
بیم غیر اللہ عمل را دشمن ست | کاروانِ زندگی را رہزن ست
بیم چوں بندست اندر پائے ما | ورنہ صد سیل ست در دریائے ما
ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست | اصلِ او بیم ست اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ | ایں ہمہ از خوف میگیرد فروغ

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اسلام سے پہلے انسانی ذہن و فکر کو وہ آزادی حاصل نہ تھی جسے آج ہم علم و تہذیب کا طرہ امتیاز سمجھتے ہیں۔ انسان موجودات فطرت کی پرستش کرتا تھا اس لئے وہ کبھی اس پر جری نہ ہو سکا کہ ان کو اپنا تابع اور مسخر بنائے چاند، سورج، برق و باراں، پہاڑ، دریائیں۔ غرض کہ اس قسم کی تمام چیزیں اس کے نزدیک معبود کی حیثیت رکھتی تھیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ان کا کسی طور پر تجزیہ کرتا یا ان پر قدرت حاصل کرنے کی جرأت کرتا اس سے

ترقی کر کے انسان نے انسان کی پرستش شروع کی۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں کبھی اس نے اپنی ہی نوع کو مذہبی حیثیت سے قادر مطلق گردانا اور کبھی کسی جابر قہرماں کے آگے جھکا۔ اس کا ایک نہایت دل نشیں خاکہ رموز بیخودی میں اقبال نے یوں پیش کیا ہے ؎

بود انساں در جہاں انساں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بند ہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت باج بر کشتِ خراب او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

ایک دوسرے مقام پر اس کا اعادہ یوں کیا ہے ؎

فکرِ انساں بت پرستے بتگرے ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت ست تازہ تر پروردگارے ساخت ست
کاید از خوں ریختن اندر طرب نام او رنگ ست و ہم ملک و نسب

اگر غور کیا جائے تو اسلام نے سب سے بڑی نعمت جو دنیا کو تفویض کی وہ یہ ہے کہ ہر انسان علم و عمل کے لیے آزاد ہے اس طور پر بقول اقبال اسلام کو ایک وسیع علمی تحریک قرار دینا چاہیئے

یہ ایک حقیقت تھی جس کو اسلام سے قبل طرح طرح سے مستور رکھا گیا۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اس نے اس حقیقت کو فطری ہی طور پر برافگندہ نقاب بھی کیا' اس نے محض ایک مقولہ نہیں پیش کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ نمونہ بھی دنیا کے سامنے لاکھڑا کیا اور وہ بھی اس سہل اور سادہ انداز سے کہ معمولی سے معمولی عقل و تمیز بھی اس سے پوری طور پر آشنا ہوسکی۔ اسلام کے خدا نے اسلام کا محض اپنے کلام و الہام سے اعلان نہیں کیا بلکہ اس کو جناب رسالت مآبؐ کی ذات میں ثابت بھی کر دیا۔

رسالت مآبؐ کے وجود حیات سے نہ صرف یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کیا ہے بلکہ انسان کو کیا کرنا ہے اور جو کچھ کرنا ہے وہ کر بھی سکتا ہے' نظر برآں رسالت مآبؐ کی زندگی کو خدا سے وہی نسبت حاصل ہے جو انسانوں کو رسالت مآبؐ سے حاصل ہے۔ اس لئے جہاں تک علم و عمل کا دخل ہے رسالت مآبؐ کی زندگی ہم انسانوں کے لیے خدا کی ذات و صفات سے زیادہ قریب' زیادہ قابلِ تقلید اور زیادہ ممکن العمل ہے' ممکن ہے اسی عقیدہ کا اظہار اقبالؔ نے ان الفاظ میں کیا ہو ؎

معنیِ حرفم کنی تحقیق اگر — بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبی — از خدا محبوب تر گردد نبی

رسالت مآبؐ نے دنیا کے سامنے جو دستور العمل اپنے نمونۂ زندگی سے پیش کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "حریت" "مساوات" و "اخوت بنی نوع انسان" کی بنیاد اس کا نمونہ اور اس کا مقصود "رسالت محمدیہ" تھی عالم انسان کی نجات ان ہی ہر سہ حقیقتوں کی تشکیل و تعمیم میں مضمر ہے۔ حریت نے ہر انسان کو انفرادی طور پر آزاد کیا۔ مساوات نے ان سب کو باعتبار فطرت ایک سطح پر لا کھڑا کیا اور پھر ان دونوں کو جس نے دنیا کیلئے باعث رحمت و عافیت بنایا وہ "اخوت بنی نوع انسان" تھی۔ اسلام کے اصطلاحی اور محدود مفہوم سے قطع نظر کر لیا جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان صفات کے اعتبار سے اسلام زمان و مکان دونوں کی قید سے آزاد ہے۔

ممکن ہے۔ یہی سبب ہو جس کی بنا پر

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد | بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را | او رسل را ختم و ما اقوام را

خدمت ساقی گری با ما گذاشت | داد ما را آخریں جامے کہ داشت

اقبال کے زبان پر آیا ہو۔

حریت، مساوات اور اخوت کی بنا پر قومیت کا جغرافیائی مفہوم بالکل بے معنی ہو جاتا ہے "یعنی اسلامزم" کا رمز ملک گیری

میں نہیں بلکہ "اخوت بنی نوع انسان" میں مضمر ہے ترکوں کا جدید رویہ جس کی بنا پر انھوں نے جمہوریہ ترکی کو "وطنیت ترکیہ" پر قائم کیا ہے اس بنا پر صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے ترک یا ترکی اور اسلام کو دو مختلف حیثیتیں دیدی ہیں۔ عزل خلافت سے انھوں نے اسلام کے مفہوم کو بھی مسخ کر دیا ہے' خلافت کا کام یہ نہ تھا کہ اسلام کے دینی اقتدار کو دنیوی طاقت سے برقرار رکھا جائے بلکہ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ دنیوی اقتدار کو ان پابندیوں سے بے نیاز نہ ہونے دیا جائے۔ جن سے آزاد ہو کر حکومت اور اس کی نعمتیں محض ایک ہی قوم اور ایک ہی خطہ تک محدود نہیں رہ جاتیں بلکہ دوسری اقوام اور دوسرے ممالک کے لئے موجب آزار ہوتی ہیں۔ حکومتِ ترکی نے وطنیت ترکیہ کے قائم کرنے میں یوں غلطی کی ہے کہ اس نے نہ صرف اسلام کی ہمہ گیری اور اس کے فیض عام کو ترکی تک محدود کر دیا اور شاید یہ بھی متیقن نہیں ہے۔ بلکہ ایک طور پر اس نے دوسرے اقوام کو بھی اسلام کی خوبیوں سے بے خبر رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اسلام صرف مسلمانوں کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ یہ دوسرے اقوام اور دوسرے ممالک کے لئے بھی ایک پیام عمل و عافیت ہے اسلام صرف اسلامیوں کے لئے نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے لئے ایک عام تبلیغ عمل ہے جس کو کسی صورت

میں محدود نہیں کرنا چاہیئے ملت اسلامیہ زمان و مکان دونوں قیود سے آزاد ہے اور یہی سبب ہے کہ اسلام میں نسل و ملک کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ ؎

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست ‏ ‏ ‏ بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست ‏ ‏ ‏ رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست ‏ ‏ ‏ مرز و بوم او بجز اسلام نیست
مسلم استی دل باقلیمے مبند ‏ ‏ ‏ گم مشو اندر جہانِ چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم ‏ ‏ ‏ در دلِ او یاوہ گردد شام و روم

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود ‏ ‏ ‏ از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد ‏ ‏ ‏ بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم ست ‏ ‏ ‏ ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم ست
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو ‏ ‏ ‏ یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند ‏ ‏ ‏ بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند ‏ ‏ ‏ نوعِ انساں را قبائل ساختند

؎ مسلم استی بے نیاز از غیر شو ٭ اہلِ عالم را سراپا خیر شو

مردمی اندر جهان افسانه شد
آدمی از آدمی بیگانه شد
روح از تن رفت و هفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند
تا سیاست مسندِ مذهب گرفت
این شجر در گلشنِ مغرب گرفت
قصهٔ دینِ مسیحائی فسرد
شعلهٔ شمع کلیسائی فسرد

باده ها خوردند و صهبا باقی ست
دوشها خون گشت و فردا باقی ست
در سفر یارست و صحبت قائم ست
خود ره گیرست و ملت قائم ست
فرد بر می خیزد از مشت گلے
قوم زاید از دلِ صاحبدلے
گرچه ملت هم بمیرد مثلِ فرد
از اجل فرمان پذیرد مثلِ فرد
امت مسلم ز آیاتِ خداست
اصلش از هنگامهٔ قالوا بلیٰ ست
از اجل این قوم بے پرواستے
استوار از نحن نزلناستے
سطوت مسلم بخاک و خون تپید
دید بغداد آنچه روما هم ندید
تو مگر از چرخ کج رفتار پرس
زان نوآئین کهن بیدار پرس
آتش تاتاریان گلزار کیست
شعله هائے او گلِ دستار کیست
رومیان را گرم بازاری نماند
آن جهانگیری جهانداری نماند
شیشهٔ ساسانیان در خون نشست
رونقِ خمخانهٔ یونان شکست
مصر هم در امتحان ناکام ماند
استخوانِ او تهِ اهرام ماند
در جهان بانگِ اذان بودست و هست
ملتِ اسلامیان بودست و هست

ملّت کی بنیاد اختلاط افراد پر ہے لیکن خود ملت کی شیرازہ بندی کے لئے بھی کسی آئین یا دستور کا وجود لازمی ہے۔ ایک ایسی ملّت کے لئے جو تمام عالم کے لئے ابد الآباد تک ایک زندہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہو ضرور ہے کہ اس کا آئین بھی اتنا ہی ہمہ گیر اور لازوال ہو، جیسا کہ اس سے پہلے کہیں آ چکا ہے۔ افراد اور ملت دونوں کسی نہ کسی حد تک فنا پزیر ہیں لیکن مقصد حقیقی ان اسالیب عمل سے بلند و پائندہ تر ہوتا ہے۔ جس کی طرف اقبالؔ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ؎

فصلِ گل از نسترن باقی تر است ٭ از گل و سرو و سمن باقی تر است
گانِ گوہر پروری گوہر گرے ٭ کم نہ گردد از شکستِ گوہرے

ملّتِ اسلامیہ کا آئین قرآنِ مبین ہے۔ اقبالؔ نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

نغمہ از ضبطِ صدا پیدا ستی ٭ ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستی
در گلوئے ما نفس موجِ ہوا ست ٭ چوں ہوا پابندِ نے گردد نوا ست
تو ہمیں دانی کہ آئینِ تو چیست؟ ٭ زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ٭ حکمتِ او لایزال ست و قدیم
حرف او را ریب نے تبدیل نے ٭ آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں ٭ حاملِ او رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ

آنکہ دوش کوہ بارش برنتافت | سطوتِ او زہرہ گردوں شگافت
بنگر آں سرمایۂ آمالِ ما | گنجد اندر سینۂ اطفالِ ما
گر تو می خواہی مسلمان زیستن | نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اسی سلسلہ میں اقبالؔ نے ایک نہایت نازک لیکن اتنا ہی معرکتہ الآرا مسئلہ بھی پیش کیا ہے جس پر اس زمانہ میں صبر و ایمانداری کے ساتھ غور کرنا اتنا ہی ناممکن معلوم ہوتا ہے جتنا یہ ضروری بھی ہے یعنی زمانہ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے۔

آج بیرونی اثرات کے سیلاب اور مذہبی ناواقفیت (جس میں علم و عمل دونوں کا فقدان ہے) نے ہر شخص کو اس پر جری کر دیا ہے کہ وہ اسلام کی تعلیم پر نظر ثانی کرے۔ کسی مسئلے پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالنا قابل اعتراض نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ آج اجتہاد کے علم بردار کہے جاتے ہیں ان کے میلانات ذہنی یا استعداد علم و عمل کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل قوتیں برسرکار نظر آئیں گی جن کے موجود ہوتے ہوئے یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ ان نام نہاد اجتہادیوں کا طرز عمل صحیح نہیں ہے۔

ا۔ عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب ہر حال میں مفید اور قابل تقلید ہے، اس وقت زیادہ تعداد

ایسے لوگوں کی ہے جو تہذیب یورپ کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے مسلمان مصنفین جو یورپین تہذیب اور خیالات سے باخبر کہے جاسکتے ہیں یا کہے جاتے ہیں، اپنے سامنے یہ حقیقت رکھکر آگے بڑھتے ہیں کہ جو کچھ اس وقت یورپ میں تہذیب وتمدن کے اعتبار سے مفید اور بہتر خیال کیا جاتا ہے وہ اسلام کی تاریخ اور تہذیب سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ یہ اصول غلط بھی ہے اور خطرناک بھی

۲۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اسلام کے بعض اصول کو کسی طور پر کمزور یا قابل اصلاح سمجھتے ہیں وہ خود اپنے علم وعمل کے اعتبار سے جامع نہیں کہے جاسکتے۔ جب تک اسلام اور مغربی اصول دونوں کا صحیح اور مکمل تجربہ نہ ہو اس وقت تک کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔

۳۔ یورپ کو اس وقت ایک حکمراں کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے اس کو وہ سب فطری سہولتیں حاصل ہیں جو اس کے تہذیب وتمدن کو مقبول بنا سکتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں خالص اسلامی شریعت نافذ ہے وہاں اسلامی اصول کا نفاذ کہاں تک مفید یا مکمل ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کو افغانستان کی مثال سامنے رکھنی پڑے گی۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بعض حضرات

ترکی کی مثال پیش کرنا زیادہ اہم سمجھیں گے، اب تک ترکوں یا کمالیوں کا اس بارۂ خاص میں جو رویہ رہا ہے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ ترکی سلطنت صحیح معنوں میں سلطنتِ اسلامیہ نہیں ہے بلکہ محض سلطنت یا "وطنیتِ ترکیہ" کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترکی نے جو نیا ورق پلٹا ہے اس کا کچھ ہی سبب کیوں نہ ہو جن اسباب یا واقعات کے بنا پر اس نے اتنا زبردست انقلاب روا رکھا ہے وہ اسلام یا خلافت کی کوتاہیوں یا زیادتیوں کے سبب سے نہ تھا بلکہ اس کی اصلی وجہ خلفائے عثمانیہ یا دولت عثمانیہ تھی۔

۵۔ انحطاط کے زمانہ میں قوائے جسمانی و ذہنی دونوں پژمردہ ہو جاتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلاف کے کارنامے اپنے نظروں میں ناقابل رسائی معلوم ہونے لگتے ہیں، انسانی فطرت دشوار پسندی اور اولوالعزمی سے فطری طور پر کنارہ کش رہنا چاہتی ہے، قوم اور افراد دونوں فاتح کی حیثیت حاصل کرنے کی بجائے فاتحین کی ہمرکابی و ہمنوائی زیادہ پسند کرنے لگتے ہیں۔ اقبال نے اس حالت میں تقلید کو اجتہاد سے بہتر بتایا ہے ؎

عہدِ حاضر فتنہا زیرِ سر است طبع ناپروائے او آفت گر است

بزمِ اقوامِ کہن برہم ازو | شاخسارِ زندگی بے نم ازو
جلوہ اش مارا ز ما بیگانہ کرد | سازِ مارا از نوا بیگانہ کرد
از دلِ ما آتشِ دیرینہ بُرد | نور و نارِ لا اِلٰہ از سینہ بُرد
راہِ آبا رو کہ این جمعیت ست | معنیٔ تقلید ضبطِ ملت ست
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط | قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر | اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

جس طور پر ہر عمل کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے خواہ یہ انفرادی ہو یا اجتماعی اسی طور پر ملت اسلامیہ محمدی کا ایک نصب العین ہے اور وہ "حفظ و نشر توحید" ہے۔ افراد کو جو قوت جماعت کی شکل میں نمودار کرتی ہے وہ کسی مخصوص مقصد کی تبلیغ یا تشکیل ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو افراد اور جماعت کبھی ایک دوسرے سے وابستہ نہ ہوسکیں اس لئے "جمعیت" کا مدار کسی مخصوص نصب العین کی تعمیر و ترمیم پر ہے لیکن "حقیقی جمعیت" اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب نصب العین بھی ہر طور پر مکمل و مستحسن ہو۔ اس عالم حیات کا اصلی راز تبلیغ توحید میں مضمر ہے اور چونکہ اسلام کو دین فطرت ہونے کا دعویٰ ہے اس لئے مقصد بھی اتنا ہی عالمگیر اور مقدس ہے ؎

ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل | کیف و کم از وے پذیرد ہر عمل

گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست | تیز از سعیِ حصولِ مدعاست
صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست | صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست
نالہ ہا در کشتِ جاں کاریدہ است | تا نوائے یک اذاں بالیدہ است
نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ | انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست | حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست
جلوہ در تاریکیِ ایام کن | آنچہ بر تو کامل آمد عام کن
لرزم از شرمِ تو چوں روزِ شمار | پرسدت آں آبروئے روزگار

حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ
پس چرا با دیگراں نہ سپردۂ

حیات انسانی کے تمام افعال و مشاغل باعتبار تعینات ہمیشہ متشکل ہوتے رہتے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ مزید سعی و کوشش کے لئے ایک نمونہ سامنے ہو اور یہ معلوم ہوتا رہے کہ ہر سعی و حرکت کس طور پر اور کہاں تک بار آور ہوئے اور جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے کیا وہ اس پایہ کی ہے کہ اس کے لئے مزید کوشش کی جائے یا اس کے قائم رکھنے میں مزید تگ و دو روا رکھی جائے۔ گویا ہر مزید کوشش ابتدائی کوشش کیلئے ایک سند جواز ہے۔ اس طور پر گویا زندگی کی یہ سعی پیہم ایک مقصد و مرکز کے لئے ہے۔ حیات ملیہ کے لئے ضروری تھا کہ کوئی

"مرکزِ محسوس" ہو۔ ملت اسلامیہ کا مرکز "بیت الحرام" ہے اقبال نے اس تفصیل و تخصیص کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ؎

در گرہ چوں دانہ دارو برگ و بر | چشم بر خود وا کند گردد شجر
خلعتے از آب و گل پیدا کند | دست و پا و چشم و دل پیدا کند

ہمچناں آئینِ میلادِ امم | زندگی بر مرکزے آید بہم
حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است | خطِّ او در نقطۂ او مضمر است
قوم را ربط و نظام از مرکزے | روزگارش را دوام از مرکزے
راز دار و رازِ ما بیت الحرام | سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام
دعوئے او را دلیل استیم ما | از براہینِ خلیل استیم ما
در جہاں مارا بلند آوازہ کرد | با حدوثِ ما قدم شیرازہ کرد
تو ز پیوندِ حرمے زندہ | تا طوافِ او کنی پائندہ
در جہاں جانِ امم جمعیت است | در نگر سِرِّ حرم جمعیت است
عبرتے اے مسلمِ روشن ضمیر | از مآلِ امتِ موسیٰ بگیر
داد چوں آں قوم مرکز را ز دست | رشتۂ جمعیتِ ملت شکست

آج یورپ کی جو چیز ہم کو سب سے زیادہ قابلِ رشک معلوم ہوتی ہے وہ اس کے فرزندوں کی "تسخیر قوائے نظامِ عالم" ہے اس میں شک نہیں جہاں تک قوائے نظامِ عالم کو مسخر کرنے کا

تعلق ہے یورپ کی ترقی بہر نوع مہتم بالشان ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو حقیقت سے آشنا ہیں یا آشنا ہونا پسند کرتے ہیں کہ جو ترقیاں علم و عمل کی آج نظر آرہی ہیں ان کی آج سے بہت پہلے مسلمانوں نے یورپ میں ابتدا کی تھی۔ یورپ کو جو برکات مسلمانوں سے حاصل ہوئیں ان کے شمار کرانے کا یہ موقع نہیں ہے، اس کا اعتراف خود اہل یورپ کر چکے ہیں، مسلمان اکثر اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ وہ عام عالم اسلام پر اس وقت جو انحطاط رونما پاتے ہیں وہ اسلام کے اساسی تعلیمات کے سبب سے نہیں ہے بلکہ اس کا باعث مسلمان خود ہیں۔ مسلمانوں سے پہلے یہ تعلیم کسی مذہب نے نہیں دی ہے کہ یہ سورج، چاند، ستارے پہاڑ، دریائیں، آبشار، برق و باد پرستش کے لئے نہیں ہیں بلکہ انسان کے تابع کئے گئے ہیں اور وہ اس کے ذہن و فکر اور قوت عمل کی مختلف وسیع جولانگاہیں ہیں۔ اسلام تو ایک شریعت عمل تھا ہم نے اس کو یا تو متکلمین و معتزلہ کی ورزش دماغی سمجھ لیا یا پھر جاہل مولویوں یا واعظوں کا وسیلۂ رزق۔ قوائے عالم کی تسخیر ڈرائینگ روم کی لطیف معصیتوں یا تکفیر کے فتووں سے نہیں کی جا سکتی اس کے لئے ضرورت تھی محنت اور قربانی کی جس سے ہم آج بھی بہت دور ہیں۔ ہم تو دوسروں

کے ثمرۂ محنت سے مستفید ہونا ہی اپنا ایک بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم اسلام کی تعلیم کو محض راہِ نجات یا بہشتی زیور کی تعلیم سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ قرآنِ پاک ایک زندہ جاوید پیغام عمل ہے جس سے منحرف رہ کر مسلمان ہی نہیں کوئی قوم دنیا میں زندہ یا کامیاب نہیں رہ سکتی حیات ملیہ اسلامیہ کا مقصد اسرارِ حیات کو اس طور پر برافگندہ نقاب کرنا ہے کہ دنیا میں امن و کامرانی کے امکانات وسیع ہوتے رہیں۔ اس لئے حیاتِ ملی کے لئے لازم ہے کہ اس کا مقصد عین تسخیر قوائے نظام عالم ہو، اقبال نے اس کی تبلیغ یوں کی ہے ؎

اے کہ با نادیدہ پیماں بستۂ ہمچو سیل از قید ساحل رستۂ
چوں نہال از خاک ایں گلزار خیز دل بغائب بند و از حاضر ستیز
ماسوا از بہرِ تسخیر ست و بس سینۂ او عرضۂ تیر ست و بس
ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد عالمے از ذرّہ تسخیر کرد
کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر تختۂ تعلیم اربابِ نظر
نائبِ حق در جہاں آدم شود بر عناصر حکم او محکم شود
آنکہ بر اشیا کمند انداخت ست مرکب از برق و حرارت ساخت ست
علم اسما اعتبارِ آدم ست حکمتِ اشیا حصارِ آدم ست

افراد کے سلسلے میں خودی کی بحث انھیں صفحات پر کہیں آچکی ہے اس لئے اس کا تذکرہ تحصیل حاصل ہو گا۔ جس طور پر افراد کے لئے استحکام خودی ضروری ہے اسی طور پر حیات ملیہ کے لئے بھی" احساس خودی" لازمی ہے جہاں تک ان اصول وعقائد کا تعلق ہے جن کے حفظ، تعمیم و تشکیل کا وسیلہ ملتِ اسلامیہ ہے یہ بحث اس سے پہلے آچکی ہے کہ ہماری حیات کا مقصد اور اس کا دار و مدار لا الٰہ پر ہے لیکن امت کو جو نسبت رسول سے حاصل ہے وہ کئی حیثیت سے اس نسبت سے زیادہ قوی ہے جو ہم کو خدا سے حاصل ہے۔ اس نظریہ سے ممکن ہے بعض بزرگوں کو غلط فہمی یا آزردگی پیدا ہو۔ لیکن اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ مسئلہ کچھ بہت زیادہ سنگین یا نازک نہیں رہ جاتا کہ باوجود اس کے کہ ؎

شرط اسلام بود ورزشِ ایمان بالغیب

اپنی جگہ پر بالکل درست ہے لیکن خدا نے بعثت نبوی میں سب سے بڑا راز یہ رکھا ہے کہ وہ جو کچھ ہم بندوں سے کرانا چاہتا ہے اس کا ہم بندوں ہی میں سے نمونہ بھی پیش کر دیا ہے تاکہ ہم اس کو اپنے لئے محض ایک آسمانی کرشمہ نہ سمجھیں جو بندوں کی فہم و ادراک یا اس کے سعی عمل سے بالا ہو۔ بلکہ ایک

ممکن العمل حقیقت تصور کریں۔ ٹھیک اسی طور پر ملت کی ترقی وبقا کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم محض عقائد مجردہ کی علم برداری کرتے رہیں بلکہ ان روایات کا احترام کریں اور اسکو برقرار رکھیں جو ہمارے برگزیدہ اسلاف نے اپنے عمل سے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں اقبالؔ نے اس کی تفصیل و توضیح ایک نوزائیدہ بچے سے کی ہے جو ابتدائے ہر شئے سے ناآشنا ہوتا ہے اور جس کا

بستہ با امروز او فرداش نیست — حلقہ ہائے روز و شب در پاش نیست
چشم ہستی را مثال مردم ست — غیر را بینندہ و از خود گم ست

رفتہ رفتہ:-

صد گرہ از رشتۂ خود وا کند — تا سرِ تارِ خودی پیدا کند
گرم چوں افتد بکارِ روزگار — ایں شعورِ تازہ گردد پائدار
نقشہا بردارد و انداز دار — سرگزشتِ خویش را می سازداد

اسی طور پر:-

قوم روشن از سواد سرگزشت — خودشناس آمد زیادِ سرگزشت
سرگزشتِ او گر از یادش رود — باز اندر نیستی گم می شود
چشم پُر کارے کہ بیند رفتہ را — پیشِ تو باز آفریند رفتہ را
ضبط کن تاریخ را پایندہ شو — از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

سر زند از ماضیِ تو حالِ تو — خیزد از حالِ تو استقبالِ تو
مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال — رشتۂ ماضی ز استقبال و حال
موجِ ادراکِ تسلسل زندگی ست
مے کشاں را شورِ قلقل زندگی ست

موجودہ زمانہ میں ہر حقیقت کی سند جواز یا عدم جواز یورپ سے حاصل کی جاتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یورپ کے اصول یا اس کے فیصلے نقائص یا غلطیوں سے مبرا ہوتے ہیں۔ بلکہ آج وہ فاتح کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے حوارئین کو ممتاز اور مخالفین کو سرنگوں کرنے کے قابل ہے، ہم آج یہ نہیں دیکھتے کہ ہم میں کیا خوبیاں ہیں بلکہ یورپ کے بعض صریح نقائص کو بھی چاہتے ہیں کسی طور پر مستحسن ثابت کر سکیں قطع نظر دیگر مسائل کے جن کو معرضِ بحث میں لانا طوالت سے خالی نہیں ہے۔ ایک مسئلہ خواتین کی تعلیم، حقوق اور آزادی کا ہے، یہاں اس سے بحث نہیں کہ یورپ نے عورتوں کو کیا سمجھ یا بنا رکھا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کا جو درجہ مقرر کیا ہے وہ ہماری نظروں میں کیا وقعت رکھتا ہے۔ تعدادِ ازدواج، پردہ اور اس قسم کی اور چیزیں ہم روشن خیالوں کے لئے نہایت روح فرسا ہیں اور مغرب کے لئے جب "حلف وفاداری" اٹھاتے ہیں تو سب سے

پہلے ہماری نظر عورت ہی پر پڑتی ہے اس کے بعد کوئی تعجب نہیں کہ اگر مذہب بھی زد میں آجائے۔ نام نہاد روشن خیال طبقہ کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے یا ان کی میلانات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت روشن ہوجائے گی ان میں سے ہر ایک کی نظر صرف دو نقائص پر پڑتی ہے ایک مذہب دوسری عورت۔ لیکن لطف، عبرت یا تعجب یہ ہے کہ یہی دو چیزیں ہیں جو مشرق بالخصوص اسلام کے امتیازات خصوصی ہیں۔ اسلام نے عورت (بالفاظ دیگر امومت) کو کیا درجہ دیا ہے۔ اقبال کے حسب ذیل خیالات سے ظاہر ہوگا ۔

پوشش عریانیٔ مرداں زن ست ۔۔۔ حسن دل جو عشق را پیراہن ست
آنکہ نازد بر وجودش کائنات ۔۔۔ ذکر او فرمود با طیب و صلواۃ
ملت از تکریم ارحام ست و بس ۔۔۔ ورنہ کار زندگی خام ست و بس
بر دمد ایں لالہ زار ممکنات ۔۔۔ از خیابانِ ریاضِ امہات
حافظِ رمزِ اخوت مادراں ۔۔۔ قوتِ قرآن و ملت مادراں

اقبال نے نساء اسلام کے لئے سیدۃ النساءؓ کو "اسوہ کاملہ" قرار دیا ہے ؎

نور چشم رحمۃ للعالمین ۔۔۔ آں امامِ اوّلین و آخریں
بانوئے آں تاجدارِ ھل اتیٰ ۔۔۔ مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا
مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق ۔۔۔ مادرِ آں کارواں سالارِ عشق

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول | مادراں را اسوۂ کامل بتول
آں ادب پروردۂ صبر و رضا | آسیا گرداں و لب قرآں سرا

مثنوی کے اس حصے کو اقبال نے انتہائے جوش عقیدت سے لکھا ہے جس کے ایک ایک حرف سے والہانہ شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تہذیب و شائستگی کے نام سے اس پیکرِ ناموس و عفت کے ساتھ جیسا کچھ سلوک روا رکھا جا رہا۔ اقبال نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ؎

اے ردایت پردۂ ناموسِ ما | تابِ تو سرمایۂ فانوسِ ما
اے امینِ نعمتِ آئینِ حق | در نفسہائے تو سوزِ دینِ حق
دورِ حاضر تر فروش و پر فن ست | کاروانش نقدِ دیں را رہزن ست
کور و یزداں ناشناس ادراکِ او | ناکساں زنجیرِ می پیچاکِ او
چشمِ او بیباک و ناپروا ستے | پنجۂ مژگانِ او گیرا ستے
ہوشیار از دستبردِ روزگار | گیر فرزندانِ خود را در کنار
ایں چمن زاداں کہ پر نکشادہ اند | ز آشیانِ خویش دور افتادہ اند
فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند | چشمِ ہوش از اسوۂ زہراؓ بلند

تا حسینے شاخِ تو بر آورد
موسمِ پیشیں بہ گلزار آورد

خاتمہ مثنوی پر اقبال نے سورہ اخلاص (قل ھو اللہ) کی تفسیری

ہے اور اسے "خلاصۂ مطالب مثنوی" قرار دیا ہے "ھو اللہ احد" کا پیغام حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے زبان مبارک سے یوں دیا ہے ؎

آں کہ نامِ تو مسلماں کردہ است
از دوئی سوے یکی آوردہ است

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ
وائے بر تو آنچہ بودی ماندۂ

صد ملل از ملتے انگیختی
بر حصارِ خویش شبخوں ریختی

یک شو و توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن

اسی طور پر دیگر آیات شریفہ کی ترجمانی کی ہے ؎

گر بہ اللہ الصمد دل بستۂ
از حدِ اسباب بیروں جستۂ

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردشِ دولاب نیست

راہ دشوار ست ساماں کم بگیر
در جہاں آزاد زی آزاد میر

خود بخود گردد درِ میخانہ باز
بر تہی پیمانگانِ بے نیاز

فارغ از اب و ام و اعمام باش
ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش

گر نسب را جزوِ ملت کردۂ
رخنہ در کارِ اخوت کردۂ

رشتۂ ما یک تولائش بس ست
چشمِ ما را کیفِ صہبائے بس ست

ہر کہ پا در بند اقلیم و جد ست
بے خبر از "لم یلد لم یولد" ست

رشتۂ با لم یکن باید قوی
تا تو در اقوام بے ہمتا شوی

آں کہ ذاتش واحدست ولاشریک | بندہ اش ہم در نہ سازد با شریک
مومنِ بالائے ہر بالاترے | غیرتِ او بر نتابد ہمسرے
خوار از مہجوری قرآں شدی | شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

آخر میں اقبال نے "رحمۃ للعالمین" کے حضور میں "عرض حال" کیا ہے ؎

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی | جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
در جہاں شمعِ حیات افروختی | بندگاں را خواجگی آموختی

مسلم از سرِ نبی بیگانہ شد | باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد
از منات و لات و عزائے و ہبل | ہر یکے دارد بتے اندر بغل

اے کہ از احسانِ تو ناکس کس ست | یک دعایت مزدِ گفتارم بس ست
عرض کن پیشِ خدائے عزوجل | عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
ہستِ شانِ رحمتت گیتی نواز | آرزو دارم کہ میرم در حجاز
تا بیاساید دلِ بے تابِ من | بستگی پیدا کند سیمابِ من

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغاز انجامم نگر

اردو شعر و شاعری پر ایک نظر

دنیا کے تقریباً تمام اہلِ نظر اس امر پر متفق ہیں کہ ملکۂ شعر ایک عطیۂ فطرت ہے جو اکتساب سے حاصل نہیں کیا جا سکتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف شاعر بلکہ کائنات عالم کا ذرّہ ذرّہ ایک مخصوص انداز، ایک ممتاز تشخص، ایک جداگانہ نشان 'انا' رکھتا ہے۔ اسی انانیت کو صوفیہ نے مظہرِ وحدت گردانا ہے اور غالب نے اسی نظریہ کی ترجمانی کی ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

عام طور پر ہم اسے فطرت، جبلّت، سرشت یا شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ انواع سے لے کر افراد تک اس قانونِ فطرت کی

ہمہ گیری یکساں ہے۔ البتہ جو نوع بہ اعتبار خلقت بلند تر ہوتی ہے اس کے افراد میں یہ نوعی اور انفرادی امتیاز زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ خود انسان کو لے لیجئے باوجود اس کے کہ اس پر اختلاف آب وہوا، تغیرات جنسی وجسمانی تعلیم ومعاشرت، رسوم وروایات کے بے شمار انقلابات و حوادث گزر گئے نوعی اعتبار سے اس بیسویں صدی کا متمدن انسان بھی وہی انسان ہے جو آغاز تمدن سے پہلے رہا ہوگا۔ اور آج بھی جب مجلس بین الاقوام اور روشن خیال مستورات کی کارفرمائی ہے وہ اپنے آپ کو انسانیت کی نوعی تقویم اور مخصوص سرشت سے آزاد نہیں کر سکا ہے۔ اس نے جتنے قوانین یا پابندیاں اپنے یا دوسروں کے لئے وضع کیں ان میں اب بھی ہبوط اولین کی ساری سرفرازی یا نگونساری ودیعت ہے۔ غرض کہ ایک طرف تو وہ قدر مشترک جس کا نام انسانیت ہے تمام بنی آدم میں یکساں ہے۔ دوسری طرف طبعی رجحانات اور فطری خصوصیات کے لحاظ سے ہر فرد انسانی بجائے خود ایک جداگانہ عالم ہے۔ ماحول کے اثرات معاشرت کے تغیرات، تعلیم وتربیت کے فیوض، مشق ومہارت کی جلاکاری اس کے ظاہری آب ورنگ میں امتیاز پیدا کر سکتے ہیں، لیکن فطرت کے خط و خال کب چھپتے

ہیں اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ فلاں صفت وہبی ہے اور فلاں اکتسابی۔ کیوں کہ حقیقتاً یہ وہی فطری میلان ہے جو سعی و اکتساب کی طرف رہبری کرتی ہے۔

یہ فلسفہ یا منطق کا مسحور کن یا مسکت مغالطہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی بین حقیقت ہے جو بدیہی ہونے کی حیثیت سے کسی تاویل یا تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ جن افراد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسی خاص فن میں کوئی خاص کمال یا ملکہ محض محنت و اکتساب سے پیدا کر لیا ہے۔ ان کے متعلق یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیوں اس خاص شعبہ میں تحصیل کمال اور سعی و محنت کے لئے متوجہ ہوئے اور کسی دوسری صفت کے لئے جانفشانی اور جگر کاوی کیوں نہ گوارا کی۔ ایک شخص کسی مخصوص استعداد کی تحصیل میں محنت کرتا ہے۔ جس میں کم و بیش کامیاب ہوتا ہے۔ ظاہر بین نگاہیں جو فطرت انسانی کی مخفی رجحانات اور لامحدود امکانات سے ناواقف ہیں۔ دیکھتی ہیں کہ یہ حاصل شدہ کمال باہر سے آیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ذوق طلب کی تشنگی خود اس بات کا پتا دیتی ہے کہ سرچشمۂ فیض ابلنے کے لئے آمادہ ہے۔ ابتدا میں خود صاحب کمال اپنے استعدادات مخفی سے بے خبر رہتا ہے مگر بے حس نہیں ہوتا۔ فطری صلاحیت کا

یہی احساس ہے جو قوائے عمل کو بیدار کرتا ہے۔ ہر انسان کو آغاز شعور سے اپنے فطری مذاق کے مطابق ایک ناقابل بیان خلش یا طلب محسوس ہوتی ہے۔ حالات موافق رہے اور زمانے نے مساعدات کی تو فطرت کا یہی شرارۂ مخفی شعلۂ طور بن کر بھڑک اٹھتا ہے۔ غالبؔ نے کس لطیف انداز سے اس راز کو بے نقاب کیا ہے ؎

چاک کرتا ہوں جب سے کہ گریباں سمجھا

یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پھر اس نظریہ کے ماتحت ہر وہ شخص جس نے کسی نہ کسی فن میں خاص مہارت بہم پہنچائی ہے وہ اس شخص کا ہم پلہ ہے جس میں یہ استعداد یا ملکہ فطری ہے اور اس طور پر نام نہاد اکتسابی اور ذہنی استعداد میں افادیت کے نقطہ نظر سے کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن یہاں افادیت کے نقطۂ نظر سے بحث کرنی بے محل ہے۔ سوال استعداد فطری کی کمی بیشی یا خمول و بیداری سے ہے جس میں یہ ملکہ فطری طور پر اور پوری قوت کے ساتھ موجود ہوتا ہے وہ اس استعداد کو نہایت جلد۔ نہایت خوبی کے ساتھ اور نہایت آسانی سے کارفرما کرسکتا ہے۔ دوسرے لوگ جنھوں نے اس ملکہ کو مشق و ممارست سے بہ تکلف پیدا کیا ہے وہ نسبتاً دیر میں معمولی طور پر اور دقت

کے ساتھ اس کو بر سر کار لا سکتے ہیں اور یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے۔

اس کلیہ کے تحت میں جب ہم کائنات فطرت کا مطالعہ یا مشاہدہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام موجودات جن سے ہم کسی نہ کسی طور پر باخبر ہو سکتے ہیں خواہ ان کا وجود محسوس و مرئی ہو یا ذہنی و خیالی۔ ان کی ایک حیثیت تو ذاتی ہوتی ہے اور دوسری اضافی جو دوسری اشیاء موجودات کی نسبت سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی دوسری حیثیت کا سب سے نمایاں پہلو وہ نسبت اضافی ہے جو انسان کو موجودات عالم سے ہے۔ یہ حیثیت فاعلی بھی ہوتی ہے اور انفعالی بھی۔ یعنی ہم نے ان کو کب جانا کیوں کر جانا اور کس حد تک جانا۔ کہاں تک اِن کی تسخیر میں کامیاب ہوئے اور ان کو اپنے ارادات اور امیال کا تابع بنایا اور خود ان سے کس حد تک اثر پذیر ہوئے۔ یہ ہی شئے ہے جو حقیقت میں ارتقائی تمدن کا معیار ہے۔

یہاں پہنچ کر مسئلہ زیر بحث کی نوعیت اور پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ ایک ہی شئے کو مختلف طبائع مختلف رنگ میں دیکھتی و سمجھتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں کون قرین حقیقت ہے سب سے مشہور مثال سُنار، نان بائی، اور شاعر کی ہے۔ ان

میں ہر ایک نے اپنے اپنے میلان اور مشغلہ کے مناسبت سے آفتاب کی مختلف تعبیریں کی تھیں اور کسی ایک کے فیصلہ کو غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بظاہر یہ بات مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں ایک بڑی حقیقت پوشیدہ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اپنے نوامیس فطری کے اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں جن میں کبھی فرق نہیں آتا۔ لیکن دنیا میں جتنے انسان ہیں وہ بہ اعتبار طبائع آپس میں مختلف ہیں۔ اس لئے خارجی اثرات سے وہ مختلف طور پر متاثر بھی ہوتے ہیں۔ ہوا چلتی ہے۔ اس کی حرکت ایک مستقل حیثیت اور میلان رکھتی ہے۔ لیکن مختلف سازوں سے برآمد ہوتی ہے تو مختلف آوازیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پہاڑوں، وادیوں جنگلوں اور مرغزاروں سے گزرتی ہے تو ہر جگہ سے بظاہر مختلف لیکن مجموعی طور پر ہم آہنگ نغمے نکلتے ہیں۔ دوسری جانب "ساز انسانی" ہے جو اس درجہ متنوع اور پیچیدہ واقع ہوا ہے کہ اس کا ہر "پردہ ساز" ایک مستقل "نوائے راز" پیدا کرتا ہے۔ یہ نغمے ہوتے تو ہیں اضطراری مگر ان پر شعور اور اختیار کی مرصع کاری ہوتی ہے۔ یہیں سے ہر قسم کی دشواری یا برتری کا آغاز ہوتا ہے اور یہ ہی وہ "طغرائے امتیاز" ہے جس کی بنا پر انسان کو اشرف المخلوقات مانا گیا ہے۔ اور "خلافتِ الٰہی" کا

شرف دیا گیا۔

شعریت عالم ہستی کی سب سے مکمل مخلوق انسان ہے اس کا سبب یہ ہی ہے کہ وہ دنیا کی دیگر مخلوقات کے علاوہ اور ان سے کہیں زیادہ موجودات عالم کے راز ہائے حقیقت سے واقف ہونے کی استعداد رکھتا ہے۔ تجسس اس کی فطرت ہے اس کی تمام مساعی کا محور یہ ہے کہ کائنات کے پوشیدہ حقائق کو دریافت کرے اور ان کا باہمی توازن معلوم کرے اور پھر ان کو فرداً فرداً یا مجموعی طور طور پر عالم انسانیت سے ہم آہنگ بنائے۔ وہ حقائق کو محض بے نقاب نہیں کرتا بلکہ اشارہ، تمثیل، تقریر یا تحریر سے ان حقیقتوں کو دوسروں کے لئے جو باعتبار استعداد و قابلیت اس سے فروتر ہوتے ہیں، سریع الفہم اور سہل الحصول بنا دیتا ہے۔ ان کے امکانات کی توسیع کرتا ہے اور بالآخر ان کو زندۂ جاوید بنا دیتا ہے۔ لیکن ان حقیقتوں سے آشنا اور لطف اندوز ہونے کے لئے ایک مخصوص رجحان ذہنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس سے ہر کس و ناکس آگاہ نہیں ہوتا۔ ہر شے واقعہ یا حالت کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرنا، ان کے مخصوص مخفی اور دلکش شیون دریافت کرنا، ان کے ظاہر و باطن، حرکت و سکون زیر و بم، نشیب و فراز، رنگ و بو اور کیف و کم سے متاثر و ہم آہنگ ہونا "شعریت" ہے یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو ہم کو سود و زیاں،

تکلیف و راحت، شہرت و گمنامی سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ لیکن اس طور پر نہیں کہ رہبانیت کی محرومی یا نام نہاد تصوف کی اجل زدگی ہماری زندگی پر محیط ہو جائے۔ بلکہ شعریت کا یہ ملکہ ہم کو زندگی کی تلخیوں کو محسوس نہیں ہونے دیتا۔ اور رزم حیات کی کامیابیوں میں معین ہوتا ہے۔

"شعریت" "حقیقت آگہی" کا ایک دلکش اور جامع مترادف ہے۔ حقیقت سے باخبر ہونا ایک ایسی نعمت و سعادت ہے اور وہ ہماری مسرتوں کا ایک ایسا لامحدود اور لازوال سرچشمہ ہے کہ اس کی بے دریغ بخششوں کے مقابلہ میں زندگی کی ساری تلخیاں ہیچ محسوس ہونے لگتی ہیں۔ شعریت سے مراد منظوم حماقتیں نہیں ہیں اور نہ اس سے شاعروں کا مخصوص انکسار، بد دماغی یا حلیہ ہے ترک موالات کی مانند شعریت ایک طرح کا میلانِ ذہنی ہے۔ یہ ایک ایسی امید ہے جو کبھی مایوسی میں نہیں تبدیل ہوتی۔ کوئی انسان خواہ وہ سفرِ حیات کی کسی منزل میں ہو اور اس کا شغل زندگی کچھ ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ اپنے کام میں خوشی محسوس کرتا ہے اگر وہ اپنی زندگی کے جواز میں اپنی ہی زندگی پیش کر سکتا ہے اگر وہ اپنی زندگی کو انعام الٰہی سمجھتا ہے، اگر اس نے اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں کوئی ایسی مسرت محسوس کی ہے جس کے حصول میں خود

اس کے قول یا فعل کو دخل رہا ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی کا محاسبہ کر کے اس کے نتیجہ سے مسرور یا محزوں ہوتا ہے بالفاظ دیگر ایسا انسان جو اپنے ہی عمل کو اس عمل کی سزا یا جزا سمجھتا ہے شعریت سے آشنا ہے۔ اس تفصیل پر غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ کوئی شخص خواہ وہ عرف عام میں شاعر کہلائے یا سائنس داں آقا یا غلام، مریض یا تندرست، مفلس یا تونگر، موحد یا ملحد کچھ بھی کیوں نہ ہو اگر متذکرہ صدر خصوصیات میں سے کسی ایک کا بھی حامل ہے تو وہ شعریت سے بہرہ ور ہے۔

شاعری

شعریت کے بعد ہم کو شاعری کا جائزہ لیتا ہے۔ اب تک شاعری کی جتنی تعریف کی گئی ہے ان سب میں باوجود اس کے کہ ان الفاظ میں شعریت کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے سب نے بالاتفاق اسی استعداد کو پیش نظر رکھکر اظہار مطالب کیا ہے۔ بعضوں نے شاعری کے سلسلہ میں یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ اب تک جو تعریف شعر کی گئی ہے وہ صرف "تعریف" ہے اچھے اور برے شعر کا کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ اعتراض بجائے خود کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ کیونکہ شعر سے مراد محض تک بندی یا وزن و قافیہ کی بے جان میکانیکی پابندی نہیں ہے۔ تعریف (ڈفنیشن کے مفہوم میں) ہمیشہ آئیڈیل کی کی جاتی ہے اور صحیح

آیڈیل وہ ہے جہاں تک رسائی ناممکن ہو اس لئے بہترین اشعار بھی آیڈیل کے حدود تک نہیں پہنچتے۔ نظر بر آں یہ بے جا نہیں ہے کہ شعر کی منطقی حد (تعریف) ایسی کی جائے جو صرف صحیح نمونوں پر منطبق ہو سکتی ہو بُرے اشعار کی بحیثیت فن شاعری کوئی اہمیت نہیں ہے اس لئے اس کو نظر انداز کرنا بے جا نہیں ہے۔

شعریت جیسا کہ اس سے پہلے ظاہر کیا گیا ہے ایک ذوق ایک وجدان یا ایک قسم کا میلان ذہنی ہے۔ اس کا تعلق براہِ راست "انسانیت" سے ہے۔ یہ ایک افتادِ طبع ہے۔ اس وجدان کی صحیح کارفرمائی اور پھر اس کی صحیح و دلکش ترجمانی کرنا اور اس کو مرئی اور متشکل بنانا لیکن اس انداز و سلیقہ سے کہ تصور و تصویر میں بیش از بیش مناسبت ہو شاعری ہے۔ یہ شاعری کا وسیع ترین مفہوم ہے اور اس میں ہر انسانی فعل آسکتا ہے۔ مثلاً نظم و نثر تحریر و تقریر نقاشی و مصوری، موسیقی، رقاصی، تعمیر اور وہ تمام اقوال و اعمال جن کو ایڈیٹر صاحب "سچ" قابل تحسین یا سزاوار سرزنش سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ ترجمانی کس طور پر ہونی چاہیئے اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے ایک نہایت وسیع اور پیچیدہ مسئلہ ہے اور جس پر عمل کرنے کی کم از کم ہندوستان کے اردو شعرا کو سخت ضرورت ہے۔ اس لئے اس موقع پر ایک حد تک بسط و تفصیل ضروری ہے۔

۱۔ آج کثرت سے ایسے شعرا ملیں گے جن کو الفاظ اور اوزان پر غیر معمولی قدرت ہوتی ہے ان کے ذہن میں کوئی خیال نہیں ہوتا چوں کہ الفاظ و تراکیب پر قدرت ہوتی ہے وہ بلا تامل ان کو مختلف طور پر ترتیب دے دیتے ہیں اور بعد میں دیکھتے ہیں تو ان میں معانی و مطالب بھی پا جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض الفاظ اور فقرے ایسے ہیں جن کو کسی نہ کسی طور پر کہیں نہ کہیں رکھ دیجئے ایک طرح کا ترنم ہوبہو اور غیر متعین مفہوم خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ان الفاظ و فقرات کے معانی و مطالب پر غور کرنے کی شاعر کو ضرورت نہیں محسوس ہوتی کیونکہ سامعین کا زیادہ حصہ ایسا ہوتا ہے جو ان الفاظ پر محض بر بنائے عقیدت یا لاعلمی سر دھننے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ان میں سے بعض الفاظ یہ ہیں۔

بادۂ عرفاں، عہدِ الست، برقِ طور، وادیِ ایمن، ترانۂ منصور خمارِ ہستی، خوابِ عدم، صبحِ ازل، خوابِ زلیخا، فریبِ ہستی طلسمِ مجاز، آبلہ پا، جنونِ خرام، عرض و جوہر وغیرہ وغیرہ

۲۔ دوسرا گروہ ایسا ہے جو لکھنے سے پہلے سوچتا بھی ہے لیکن ان کے تصور و تخیل کی دنیا وہی فرسودہ و پامال زمین ہے جس پر ہزاروں قافلے گزر چکے ہیں یہ طبقہ عموماً بڑے بڑے شعرا کے نتائجِ فکر کو سامنے رکھ کر خیال آرائی کرتا ہے

بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ یہ لوگ اساتذہ کے الفاظ اور بندشوں کی نقل تو کسی حد تک کر لیتے ہیں۔ لیکن خیالات کی وسعت اور عمق کو نہیں پہنچتے۔ کبھی صورت حال بر عکس ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ ہم اساتذہ کے مدمقابل ہیں۔ حالانکہ یہ ان کی نفسیاتی غلطی ہے۔ ایسے لوگ شعریت کے مفہوم سے قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں ہر شاعر کا ایک مخصوص اندازِ فکر ہوتا ہے اور اسی رجحان کے مطابق اپنے مخصوص انفرادیت کے ساتھ وہ اپنے خیالات کو الفاظِ موزوں کا قالب دیتا ہے دوسرے لوگ اس سے نا آشنا ہوتے ہیں اور اسی لئے ناکامیاب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مسلم الثبوت شعرا (ہمارے محترم مولٰنا اقبال سہیل معاف فرمائیں) دوسروں کے کلام پر اصلاح نہیں دے سکتے۔ بلکہ اکثر شاگردوں کا تقریباً سارا کلام کاٹ کر اسی زمین میں اپنا کلام حوالہ کر دیتے ہیں۔ اس طریقۂ کار سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ شعر و شاعری میں اختراع و جدّت کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ دوسرے شعر و شاعری خود فرسودہ ہو جاتی ہے اور بعض ہونہار طبیعتیں یا تو غلط راستہ پر لگ جاتی ہیں یا بالکل بجھ جاتی ہیں۔

٣- آج کل زیادہ تعداد ایسے شعرا کی ہے جن کا مبلغ علم ناکافی ہوتا ہے۔ شاعری کے لئے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ

کم از کم ایک سے زیادہ زبانوں پر عبور ہو۔ اُردو کے قدیم اساتذہ فارسی اور عربی میں کامل مشق و مہارت رکھتے تھے۔ موجودہ دور میں صرف اُردو سے واقف ہونا شاعر بننے کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں جب جانچنے، تولنے اور پرکھنے پر بہت زور دیا جاتا ہے اور نشر و اشاعت کی غیر معمولی سہولت کی وجہ سے ہر چیز ایک دوسرے کے مقابلہ میں دیکھی و جانچی جاتی ہے اردو کا مقابلہ بہ حیثیت ایک ادب کے صرف ایک عربی فارسی یا مختلف ہندوستانی زبانوں سے نہیں ہے بلکہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے یعنی انگریزی، المانی، فرانسیسی، روسی وغیرہ۔ ان زبانوں کے مقابلہ میں اردو کو ابھی بہت زیادہ ترقی کرنے کی ضرورت ہے۔ جو صرف اس طور پر پوری ہوسکتی ہے کہ ان ادبیات کا نہایت گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس طور پر حاصل کئے ہوئے نتائج یا تاثرات کو احتیاط اور سلیقہ کے ساتھ اردو نظم و نثر میں اس طرح منتقل کیا جائے کہ ایک طرف بے معنی نقالی نہ ہو اور دوسری طرف وہ محاسن اُردو ادب میں اس طور پر جذب ہوجائیں کہ بالکل فطری اور اصلی معلوم ہوں۔ لیکن یہ حقِ ترجمانی صرف اس وقت ادا ہوسکتا ہے جب ہم مطالعہ کتب، مطالعہ فطرت اور وسیع النظر ارباب ذوق کی صحبتوں سے مستفید ہوں۔ پہلے لوگ اگر خود شعر و سخن کا شغل نہیں رکھتے

تھے تو کم از کم شعراء و علماء کی صحبتوں کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس سے طبیعتیں سلجھی تھیں اور سوسائٹی کا مذاق نکھرتا تھا۔ اس لئے ہر شاعر کے لئے لازمی ہے کہ اسے مختلف زبانوں پر عبور ہو اور ان لوگوں کے فیض صحبت سے مستفید ہو جو اس وادی کے نشیب و فراز سے آشنا ہیں اور ایک حد تک قطع مسافت کر چکے ہیں۔ نظم و نثر میں کامیابی اور کمال حاصل کرنے کے لئے ارباب ذوق و بصیرت کی صحبت محض اس خیال سے ضروری نہیں کہ اپنے کلام پر ان سے اصلاح لی جائے یا ان سے کسی کتاب کا درس لیا جائے یا معلومات کا سرمایہ فراہم کیا جائے حقیقتاً یہ چیزیں زیادہ ضروری نہیں ہیں۔ ان سے محض ایک طرح کی عقیدت رکھنا اور اکتساب علم و ہنر میں ان کی طرف سے بے توجہ نہ ہونا، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ گفت و شنید مزاج و تفریح وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کا اثر اتنا گہرا اور مفید ہوتا ہے کہ آپ سالہا سال صرف مطالعہ کتب میں مصروف رہیں وہ باتیں میسر نہ آئیں گی۔ مطالعہ کتب کا مقصد محض ذخیرہ معلومات کی فراہمی ہے۔ مگر ارباب بصیرت کے فیض صحبت سے ان معلومات حاصلہ کی صحیح ترتیب آجاتی ہے اور حصول معلومات کا صحیح طریقۂ کار معلوم ہو جاتا ہے اور ذخیرہ کتب میں جو سرمایہ فراہم ہے ان کے متعلق اخذ و ترک کا صحیح ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات نہایت معمولی اور ایک حد تک مضحکہ انگیز معلوم

ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کو اس کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس سے مطالعہ میں کتنا لطف آتا ہے اور مطالعہ کا مقصد اس سے کس حسن و خوبی سے پورا ہوتا ہے بسا اوقات پانچ پانسو صفحات کی کتاب میں صرف نصف درجن جملے یا الفاظ ایسے ملیں گے جن سے مطالعہ کی ساری کلفتیں دور ہو جاتی ہیں اور ان الفاظ و فقروں سے ایسی بصیرت اور ایسا انشراح صدر نصیب ہوا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

موجودہ دور میں اردو نظم و نثر میں جو انقلابات گزر رہے ہیں ان کو دیکھ کر ہم میں سے بعض لوگ خوش ہوتے ہیں، بعض کڑھتے ہیں، بعض انگشت بدنداں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت تمام دنیا نئے نئے خیالات اور نئے نئے تجربات کے ورطہ میں ہے اور ایک نامعلوم لیکن موثر طریقہ پر ہمارا ذہن و دماغ ان سے متاثر ہو رہا ہے۔ قدیم و جدید کے تصادم سے جو شعلہ اٹھا ہے اس نے بہتوں کی نگاہ خیرہ کر دی ہے۔ اردو شعر و شاعری بھی اسی زد میں ہے وہ لوگ جو ان جدید خیالات اور افکار سے متاثر ہو چکے ہیں یا لطف اندوز ہوتے ہیں وہ اردو شعر و شاعری کو اسی معیار سے جانچتے ہیں اور قدرتی طور پر مایوس ہوتے ہیں۔

ہم۔ راقم الحروف کا ذاتی خیال ہے کہ شعر و شاعری میں

کثرت کے ساتھ ایسے الفاظ شامل ہوگئے ہیں جن کا مفہوم غیر متیقن ہے اور بیشتر اس وقت ایسی ترکیبیں استعمال کی جاتی ہیں جب شاعر کو خود اپنا مفہوم متیقن نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات تعین و تفصیل کی جگہ اجمال و ابہام خود حسن شاعری کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ بلکہ شاعری کا کمال تو یہ ہے کہ سننے کے ساتھ قلب و دماغ پر ایسی کیفیت طاری ہو کہ اس عالمِ بے خودی میں جزئیات سے بے التفاتی ہو جائے اور نقائص شعری بھی (اگر ہوں) نظر انداز ہو جائیں۔ لیکن کم درجہ کے شعرا اور اکثر بلند پایہ اصحاب فکر بھی اس رعایت یا خصوصیت سے فائدہ نہیں بلکہ نقصان اٹھاتے ہیں اور شعر و شاعری پر اس کا نہایت مضر اثر پڑتا ہے۔

بسا اوقات فضائے تخیل میں ایک جدید خیال کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے اور ہم قبل اس کے کہ خود اس خیال کے حدود و متعین کریں اس کی پوری وسعت اس کی صحیح گہرائی اور اس کے حقیقی وزن پر التفات کریں یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہمارے ذخیرۂ الفاظ میں کونسا لفظ ایسا ہے جو کسی نہ کسی حد تک ہمارے اس کارنامہ (فکری) کا احاطہ کر سکتا ہے اور آسانی کے ساتھ مل سکتا ہے۔ اس معاملہ میں ہم تفتیش و جستجو سے بھی بچنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ الفاظ پر غور کرنے سے پہلے ہم کو اپنے خیالات پر عبور حاصل کرنا چاہیئے اسکے

بعد سوچنا چاہیئے کہ ہم کو کونسا لفظ لینا چاہیئے یا ان خیالات کو ظاہر یا واضح کرنے کے لئے کیا پیرایہ بیان اختیار کرنا چاہیئے۔ اس کی تشریح حسب ذیل مثال سے کی جا سکتی ہے۔

فرض کیجئے ہم کو کسی نئی وادی کی تلاش ہے۔ اب یہ تو ناممکن ہے کہ جو منزلیں ہم طے کر چکے ہیں اور جتنے نشانات منزل ہمارے سفر میں نظر سے گذرے ہیں انھیں کو ہم اپنے جدید منزل مقصود کے لئے اختیار کریں۔ ایسا کیا گیا تو ظاہر ہے ہزار چکر کے بعد پھر اسی نقطہ پر پہنچیں گے جہاں سے چلے تھے یا جو ہمارے سامنے آچکا ہے اور یہ تحصیل حاصل ہوگی۔ اس لئے نئی منزل مقصود کے لئے لازمی ہے کہ ہم نیا جادہ اختیار کریں اور نئی منزل کا سراغ لگائیں۔ اس استعارہ کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات منزل مقصود معلوم ہوتی ہے اور ہم نیا راستہ اور نئے نشانات منزل تلاش کرتے ہیں گویا منزل مقصود کا تیقن اراستہ و نشانات منزل کی تلاش اور دریافت کا محرک اور معین ہوتا ہے دوسری جانب نئے نئے نشانات منزل ملتے ہیں ان سے ایک جدید منزل مقصود کا پتا لگتا ہے۔ اس طور پر اگر ہمارا خیال یا فکر متعین ہو چکا ہے تو ہم کو نئے نئے الفاظ اور جدید ترکیب اور بندش کی جستجو کرنی چاہیئے۔ دوسری طرف نئے نئے الفاظ کے وجود میں آنے سے

ہم کو نئے نئے خیالات کو منضبط کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اردو شعر و شاعری اس کی محتاج ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں ایک خطرہ کا ازالہ ضروری ہے۔ جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ راقم الحروف آج کل کی بعض بدعات ادبی کا موید ہے۔ اس میں شک نہیں ان دنوں اردو میں عجیب عجیب اقسام کے الفاظ اور ترکیبیں یا ان دونوں کا عجیب الخلقت مجموعہ رواج پزیر ہے جس نظریہ کا اوپر تذکرہ کیا گیا اگر اس کے ماتحت یہ ذخیرہ اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ فرض بد مذاق اور بدسلیقہ اردو دانوں نے اپنے حصہ میں لے لیا ہے اور یہ خطرہ سے خالی نہیں ہے چنانچہ اس کے روک تھام کی کوشش بھی کی جا رہی ہے جس کے سبب سے بعض حلقوں میں ایک طرح کی "ادبی ملاچی" شروع ہو گئی ہے جو اور زیادہ تکلیف دہ اور نقصان رساں ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اس وقت اردو شعرا کے سامنے دنیا کی مختلف زبانوں کے بہتر اور نادر نمونے موجود نہیں ہیں۔ فن تنقید یا شاعری پر اردو میں کوئی ایسی کتاب نہیں جو موجودہ دور کے مطالبات پر حاوی ہو اور مستقبل ادب کے لئے صحیح جادہ کی طرف رہبری کر سکے اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اردو شعر و شاعری کے سامنے جو نمونہ رہا ہے

وہ غلط ہے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ پاکیزہ اور حقیقت آشنا تخیل جس کی جولان گاہ بے انتہا وسیع ہے اور جس کے حریم ادب میں صرف شاعری کو اذن باریابی مل سکتا ہے اس پر حاوی ہونے کے لئے ضرورت یہ ہے کہ جو لوگ جہاں کہیں اور جس زمانہ میں ہیں یا رہے ہوں اور جن منزلوں کو وہ جس طور پر عبور کر چکے ہوں وہ سب ہمارے پیش نظر ہوں۔ اس لئے نہیں کہ ان کی کورانہ تقلید کی جائے بلکہ اس لئے کہ ان کی مساعی اور تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ بقول غالب ؎

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
منتے بر قدم راہروان ست مرا

جہاں تک ممکن ہو سکے ہم کو ان نکتوں پر خلوص اور ہمدردی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے جو قدما کی تکمیل میں معین ہوئے ہوں جن کے ترک یا قبول سے ان مشاہیر نے علم و فن کو زندہ کیا اور معراج کمال تک پہنچا دیا۔ مگر ان حدود سے آگے بڑھنا ٹھیک نہیں ورنہ شخص پرستی ممکن ہے کہ جدید ترقیات کا سدباب کر دے۔

شاعری کو حقیقت اور "انسانیت" کا ترجمان ہونا چاہیئے نہ یہ کہ وہ کس زبان، کس قوم، کس ملک، کس زمانہ اور کن روایات کی ترجمان ہے۔ شعرائے اردو کے سامنے میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حالیؔ

اکبر یا اقبال حسرت، اصغر، فانی و سہیل نہ ہونے چاہئیں بلکہ اس کے سامنے الوہیت کے وہ اسرار ہونے چاہئیں جن سے انسانی ہستی مرکب ہے۔ جن کے دریافت یا اظہار کرنے کی آرزو شرف انسانیت و معیار ترقی ہے اور جن کا حصول انسانی زندگی کا مقدس نصب العین ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے سامنے شعرا کے دواوین کے بجائے صحیفہ فطرت ہونا چاہیئے۔ الفاظ اور فقروں کی ترتیب کے بجائے اس کو واقعات اور حالات کی ترتیب پر نظر رکھنی چاہیئے محاورہ اور روزمرہ کے بجائے زمانہ کے نشیب و فراز اور قلزم حیات کے جزر و مد کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ ردیف و قافیہ سے زیادہ خیالات اور جذبات کی موزونی پیش نظر ہو۔ رقص ترکیب اور ترنم الفاظ کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ الفاظ و معانی میں باہم توازن بھی ہے یا نہیں۔ یہ نہیں تو پھر ممکن ہے واہ واہ خلعت و انعام حاصل ہو جائے۔ لیکن بقائے دوام کی خلعت اور ہمصفیری ملائک کا طغرائے امتیاز کہاں؟

شاعر شعریت کیا ہے اور شاعر کس کو کہتے ہیں۔ ان کے متعلق راقم الحروف کے جو مخصوص خیالات تھے وہ پیش کردئے گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں کا حامل

جس کو عرف عام میں شاعر کہتے ہیں کون ہے اور کیوں ہے۔
شاعر وہ ہے جو حقیقت کو برافگندہ نقاب کرنے میں بیک وقت صداقت، جرأت اور صناعت کو برسرکار لا سکتا ہو وہ حقیقت سے آشنا ہونے اور روشناس کرانے کے لیے تحسین و تشنیع، سزا و جزا، زمان و مکان کی پروانہ کرے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ مصوری کرے اور کمال یہ ہے کہ دیکھنے اور سننے والے بلا لحاظ مدارج اس حقیقت کو اس طرح دیکھیں اور سنیں گویا دنیا کی سب سے پہلی ہستی جس نے ان کو حقیقت آشنا کیا وہ شاعر اور صرف شاعر کی ہے۔ صداقت کا مفہوم یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہے وہ حقیقت پر مبنی ہو۔ عین فطرت ہو یا قرین قیاس و عقیدہ ہو، جرأت یہ کہ وہ بے لاگ کہے اور بے باک رہے۔ صناعت اس کو کہتے ہیں کہ جو کچھ کہے اس انداز سے کہے کہ اس سے سننے والے پر اثر پڑے اور معلوم ہو کہ یہ بات صرف اسی طور پر کہے جانے کی تھی۔

شاعری کو ایک فن بتایا گیا ہے اور محض اس بنا پر کہ اس میں شاعر اپنے تاثرات کو مقررہ اصول کے ماتحت اپنے مخصوص انداز سے ترتیب دیتا ہے۔ بظاہر اس امر کا اظہار بالکل معمولی ہوتا ہے لیکن اسی حقیقت کو نظر انداز کر دینے سے آج کل

کے شاعر اور ان کا کلام دونوں مسخ ہو گئے ہیں۔ بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ محض مقررہ اصول کے ماتحت خیالات کو موزوں کر دینا شاعری ہے کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ محض الفاظ اور جملوں کو مقررہ اوزان میں ترتیب دینا شاعری ہے۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ دل میں جو خیال آئے اُس کو من و عن بیان کر دینا شاعری ہے ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ترتیب خیال یا کلام میں اپنے انفرادی اور مخصوص حیثیت کو داخل کرنا ضروری سمجھتا ہو۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے۔ بعض لوگوں کے چہرہ پر نظر کیجئے فرداً فرداً آنکھ، ناک، کان، لب و دہن، رخسارے سب حسین نظر آئیں گے لیکن ان کے مجموعہ پر نظر کیجئے، تو مایوسی ہوگی، دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جن کے اعضا فرداً فرداً بالکل جاذب نظر نہ ہوں گے لیکن ان کا مجموعہ دل کش نظر آئے گا۔ شاعری میں یہ معاملہ اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔ بعضوں کے کلام کو آپ فن کے اعتبار سے بالکل نپا تلا پائیں گے لیکن کیف کے اعتبار سے صفر محض۔ بعضوں کے یہاں نہایت اچھے الفاظ اور چست بندشیں نظر آئینگی لیکن بحیثیت مجموعی بالکل بے نمک ہو گا۔ چند ایسے بد قسمت بھی ملیں گے جن کا کلام فن کے اعتبار سے بھی بالکل مکمل ہو گا

انتخاب الفاظ اور بندش بھی موزوں و مناسب ہو گی، بحر بھی مترنم ہو گی لیکن کیف عنقا۔

پہلی اور دوسری جماعت کے لوگ تو مسلمہ طور پر بکبر سے فقیر ہیں ان کے متعلق کچھ بھی کہنا بے کار ہے۔ ان کا کلام رائے سینا دہلی کی سرکاری عمارات ہیں جو اس درجہ یکساں اور "سپاٹ" واقع ہوئی ہیں کہ ان کی امتیازی خصوصیت صرف ان کی کثرت تعداد ہے، عمارات کے اینٹ پتھر اور بنیاد وغیرہ میں کوئی نقص نہیں نکالا جا سکتا۔ حفظانِ صحت کے اعتبار سے بھی بے داغ ہیں۔ مکان و مکیں میں بھی تناسب ہے لیکن صناعت، جدت، تنوع اور نوک پلک کی تلاش مقصود ہو تو پھر آپ کسی ہندوستانی نوشہ کی ہیت کذائی کا کیوں نہ مطالعہ کریں جو آج بیسویں صدی عیسوی میں بھی علی گڑھ ڈائننگ ہال کا کھانا بنا ہوا ہے۔

آرٹ!! تیسری جماعت یہ سمجھتی ہے کہ جو کچھ دل میں آئے وہ زبان پر نہ آسکے تو نہ آئے۔ اُسے "صفحۂ قرطاس" پر ضرور آنا چاہیئے۔ یہی کمال انشا پردازی ہے جس میں تغیر و تبدل کرنے سے آرٹ کا خون ہوتا ہے ان بزرگوں کے نزدیک ان کی ہر لغزش یا برہنگی کا جواز آرٹ میں

مل سکتا ہے۔ ان کے نزدیک دو اور دو کہنا بھی آرٹ ہے اور دو اور دو چار سو کہنا بھی آرٹ اپنی کمزوریاں بھی آرٹ اور دوسروں کی بیویاں بھی آرٹ غرض کہ آپ کسی بے تکے پن کو آرٹ بنا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ اپنی زبان و قلم، لب و لہجہ صورت شکل یا قول و فعل کو علی الرغم تعزیرات ہند یا ایڈیٹر صاحب سیج بر سرکار لا سکیں۔ بالفاظ دیگر یہ کہ نفس نفیس آرٹ بن جائیں۔

ان دنوں آرٹ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک نا اہل نے اپنی نظم و نثر میں غلو اضداد یا حیا سوزی کو کہاں تک دخل دیا۔ آرٹ کے اس مفہوم نے سخت گمراہی پھیلا رکھی ہے۔ اردو ادب میں اس وقت جو فرسودگی یا ابتذال نظر آرہا ہے اس کا راز آرٹ کے علم برداروں کی حیا سوز دلیری میں مل سکتا ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہمارے ذہن، زبان، قلم یا کسی اور مصنوعی آلہ سے جو کچھ برآمد ہو وہ عین فطرت ہے اور یہی آرٹ ہے۔ لیکن یہ لوگ کبھی یہ نہیں خیال کرتے کہ جس چیز کو ہم عین فطرت کہتے ہیں یا بتانا چاہتے ہیں وہ وہ نہیں ہے جو خود بخود دفعتہً بغیر کسی کد و کاوش کے بلائے ناگہانی کی طرح سامنے آجائے یا کسی نا اہل کی خوش قسمتی ہو جو مرگ بے ہنگام کی مانند نازل ہوتی ہے۔ فطرت کو صرف "نقش بند فطرت" بہ یک

اشارہ کُن پیدا یا بیدار کر سکتا ہے انسان خود مصنوع ہے اس لئے تخلیق فطرت اس کے لئے آسان نہیں ہے۔ وہ صرف "تطبیق فطرت" کر سکتا ہے ہمارے ذہن و دماغ میں جو باتیں پیدا ہوتی ہیں اور جن کو ہم کسی طور پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ بحیثیت اس کے کہ ان کو فطرت نے ذہن و دماغ میں پیدا یا مقید کیا۔ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں انھیں چیزوں کو جب ہم عالم ظاہر میں منتقل کریں گے تو ایک جُداگانہ اور لبنا اوقات بالکل مختلف حیثیت دینی پڑے گی ہم جو کچھ سوچتے سمجھتے یا محسوس کرتے ہیں اس کا اظہار اور وہ بھی اس طور پر کہ دوسرے بھی اسے محسوس کر سکیں اور اس سے صحیح طور پر متاثر ہو سکیں اس درجہ مشکل (بلکہ ناممکن) ہے کہ ہم سوائے اس کے کہ تشبیہ، استعارہ یا اشارہ و کنایہ سے کام لیں اور کچھ نہیں کر سکتے تشبیہ و استعارہ کی بنیاد اسی حقیقت پر ہے۔

انسان کی ترقی کا معیار یہ ہے کہ اس نے اپنے جذبات یا میلانات کو اپنے اقوال و افعال میں منتقل کرنے سے پہلے کہاں تک جانچا اور پرکھا اور ان کی تراش و خراش (تہذیب و تربیت) میں کہاں تک کوشش کی اور کامیاب ہوا اسی طور پر دل میں مختلف قسم کے خیالات آتے ہیں لیکن ان کے ظاہر کرنے کا جواز صرف

یہ نہیں ہے کہ وہ ذہن و دماغ میں پیدا ہوئے بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ کب کس طور پر اور کتنی کمی بیشی کے ساتھ ظاہر کئے جائیں کہ حق ترجمانی بھی ادا ہو جائے اور بد مذاقی کا الزام بھی عاید نہ ہو آج کل کے لکھنے والے خیالات کے پیدا ہونے سوچنے اور ان کے اظہار میں کوئی وقفہ دینا پسند نہیں کرتے۔ اور یہی ان کی اور اردو ادب کی محرومی ہے۔ خیالات کی آفرینش اور ان کے قلم بند کئے جانے کے درمیان ایک وقفہ ہوتا ہے جس میں خود نفس خیال کے ترک و قبول اور اس کے طریقۂ اظہار پر غور کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ساعت ہوتی ہے جس کو نظر انداز کرنے یا نہ کرنے سے لکھنے والا ہمیشہ کے لئے بدنام یا نیک نام ہو جاتا ہے رہ نوردان ادب کے لئے یہی منزل عالم برزخ ہے جس سے مفر نہیں۔

اس توضیح کے بعد آرٹ کی تعریف یہ رہ جاتی ہے کہ انسان کا ہر وہ کام آرٹ میں داخل ہے جو قوت فکر و فیصلہ دونوں کے صحیح استعمال کے بعد اس طرح پر پورا کیا جائے جس کے سوا اس کے انجام کا کوئی دوسرا طریقہ یا تو ممکن نہیں یا وہ کام دوسرے طریقہ پر کئے جانے کے قابل نہیں تھا۔ گویا اس مقصد کی تکمیل اسی خاص انداز میں کرنا خود منشار فطرت تھا۔ یہاں یہ معلوم ہوگا کہ آرٹ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انسانی پرواز کو فطرت تکوین سے

کہاں تک ہم آہنگ ہونا چاہیئے اور یہ منصب کتنا بلند کتنا مشکل اور کن ذمہ داریوں کا حامل ہے۔

شاعر کا آرٹسٹ ہونا لازمی ہے۔ اور آرٹ فی نفسہ صرف شعریت کا دوسرا نام ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ آرٹ یا شعریت صرف فنونِ لطیفہ تک محدود ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اوپر کے بیانات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ شعریت کا اطلاق انسان کے ہر فعل پر ہوسکتا ہے۔ اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کس طور پر شعریت کو قائم رکھکر مختلف قسم کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے اور اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے کہ آج کل کے نام نہاد شاعر جب کبھی کسی مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو یہ نہیں دیکھتے کہ اس مسئلہ کی نوعیت دنیائے "انسانیت" یا کائنات میں کیا ہے۔ بالفاظ دیگر تقدیر الٰہی کیا ہے وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس پر مختلف لوگوں نے کس طور پر اظہار خیال کیا ہے کون کون سے الفاظ اس کے لئے موزوں یا مخصوص ہیں اور قافیہ وردلیف کی پابندیاں کیا ہیں۔ وہ صرف ان امور کو پیش نظر رکھکر شعر ترتیب دیتا ہے۔ بلکہ اصلیت تو یوں ہے کہ اردو کے غزل گو حضرات ایک مصرع طرح کا لیتے ہیں اور سب سے پہلے قافیے سوچتے ہیں۔ اس قافیہ کے چقماق کو ٹھونس ٹھونس دیا دماغ سے ٹکرانے

کے بعد جو بدبو یا چنگاری (یا دونوں) برآمد ہوتی ہے وہ مصرع ثانی قرار دے دی جاتی ہے اور اسی میں مصرع اولی چپکا دیا جاتا ہے۔ اب وہ صحیح طور پر چپکا بھی یا نہیں اس کو مشاعرہ کی واہ واہ والوں سے پوچھئے۔

بعض جلیل القدر ارباب فکر نے شعرا کو ایک طور پر پیغمبری کا درجہ دیا ہے، دوسروں نے اس کو مستقبل کا واضع قانون گردانا ہے، کچھ اس کو رموز کائنات کا مفسر قرار دیتے ہیں۔ اس کی پیاری برگزیدگی محض اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ ہر چیز کا مطالعہ یا مشاہدہ خود اپنی آنکھ اور دل و دماغ سے کرتا ہے۔ وہ مستعار آلات اور خیالات کو ہمیشہ مسترد کر دیتا ہے۔ وہ اپنی تعلیم کو دلائل اور براہین سے نہیں منواتا کیونکہ شاعر کے عقیدہ میں دلیل و برہان مقدمہ و نتیجہ کی کڑی ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ایک شے "غیر جنس" ہے۔ البتہ بندہ اور خداوند کے درمیان جو واسطہ لاہوتی ہے اسکو ایک روحانی سرود سے بیدار کر دینا اور روح انسانی کو مبدء فیض سے جو حقیقی مگر لطیف ظلّی نسبت ہے اس کو ایک نوائے رنگین سے مرتعش و مشتعل کر دینا اس کا مقصد حیات ہے شاعر کی زبان سے عالم بے خودی میں ایک ترانہ نکل جاتا ہے جو سامعہ سے دماغ تک پہنچکر ہم کو وارفتہ ہستی کر دیتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ہم اپنے دامن

خیال سے کثافت عنصری کا غبار جھاڑ کر اس خاک دان آب و گل کی ناسوتی پستی سے بلند ہو جاتے ہیں اور اُس عالم میں جا پہنچتے ہیں جہاں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا خدا اور اس کی ساری کائنات اور ہم خود صرف ایک دل کش ترانے اور ایک لطیف حقیقت میں گم ہو گئے ہیں۔ جہاں کوئی خالق ہے اور نہ کوئی مخلوق۔ جہاں نہ جبر ہے نہ اختیار، نہ سزا ہے نہ جزا۔ جہاں وہ سب کچھ ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ لیکن کسی طور پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ جس کی لطافت تاب اظہار نہیں لا سکتی جس کی رنگ آرائیوں کو لمس نظر گوارا نہیں اور جس کا احساس ایک ایسی نازک، بسیط اور روح پرور کیفیت ہے جو اپنے علم کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اصغر نے کیا خوب کہا ہے ؎

مضراب محبت سے ایک نغمۂ لاہوتی
پھر جوشِ ترنم سے بیتاب رگِ جاں ہے

اس سلسلہ میں ایک آخری سوال یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ ہمارے موجودہ شعرا اس انفرادیت کو کس طور پر بر سرِ کار لا سکتے ہیں اور اس کی ابتدا کن ضوابط کے ماتحت ہونی چاہیے۔ بالفاظ دیگر ہماری آیندہ انشاپردازی کا مدار الفاظ پر ہوگا یا معانی پر۔ اس سوال کا آسان اور محفوظ ترین جواب ایک تو وہ ہے جو "خیر الامور" کے سلسلہ میں دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک خیالات اور

معانی کا تعلق ہے ہمارا سرمایہ کافی محدود ہو چکا ہے اور اس میں اب وسعت کی بہت کم گنجائش رہ گئی ہے۔ دنیا میں "حقائق" یا "واقعات" پیدا نہیں کئے جاتے۔ یہ صرف دریافت کئے جاتے ہیں۔ ادب و شاعری میں "تناسخ" کا اصول کارفرما رہتا ہے جس طور پر ایک جماعت کے عقیدہ کے مطابق ایک ہی "روح" مختلف اجسام میں جلوہ فرما ہوا کرتی ہے۔ اسی طور پر ایک ہی حقیقت مختلف ازمنہ والسنہ میں مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ اس لئے جہاں تک روح کا تعلق ہے ہمارا کوئی بس نہیں چل سکتا۔ البتہ اس کا تزکیہ ہم مختلف طریقوں سے کر سکتے ہیں وہ بھی اسی طور پر کہ ہم اپنی محنت و ریاضت سے اس کی اصلاح و تہذیب میں مصروف رہیں۔ اسی طرح جہاں تک انشاپردازی کا تعلق ہے۔ اب صرف ایک چیز رہ گئی ہے۔ جس پر اس فن کے بے پایاں امکانات کا مدار ہے۔ اور وہ اسلوب بیان ہے۔ یعنی خیالات کی مختلف ترتیب، مختلف استعارات و تشبیہات کا برمحل استعمال کلام میں ایسی روانی اور برجستگی پیدا کرنا جس سے الفاظ بے جان نقوش نہ معلوم ہوں بلکہ جذبات کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئیں خیالات کو اس انداز سے پیش کرنا اور ایسے پیرایہ میں پیش کرنا کہ وہ دل کش و دل نشین ہو جائیں۔ بالفاظ دیگر گویا ان خیالات کو صرف

اس طور پر ادا کیا جا سکتا تھا اور کوئی دوسری صورت مناسب یا ممکن نہ تھی۔ اشعار کو ایک قسم کا ڈراما بنا دینا چاہیئے جس میں الفاظ بمنزلہ ایکٹر ہوں۔ ان کی ترتیب ڈرامہ کا پلاٹ ہو' ان کا ترنم ڈرامہ کی موسیقی ہو' ان کا اتار چڑھاو اسٹیج کے نغمہ و سرود کی ہم آہنگی ہو وغیرہ وغیرہ اس کا نام کمالِ شاعری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ادب اردو میں اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے اور کہیں کہیں جدت و اختراع کے آثار بھی نظر آتے رہیں۔ لیکن یہاں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ جادہ فرسودہ سے گریز کرنا بہر حال بہتر ہے مگر یہ گریز کبھی کبھی گمراہی کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً آج کل اردو شاعری کا سب سے بڑا نقص یہ قرار دیا جاتا ہے کہ اس میں ردیف و قافیہ اور اس قسم کی دیگر پابندیاں ایسی ہیں جو شاعر کے قدم قدم پر حائل ہوتی ہیں۔ اس لئے ان سے بغاوت کرنی لازم ہے۔ چنانچہ بغاوت شروع بھی کر دی گئی ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے ان باغیوں کا کارنامہ محض خودسری طوائف الملوکی یا "ہڑبونگ" ہے اب تک انھوں نے کوئی نظام نہیں قائم کیا ہے اور جو کچھ کیا ہے اس میں کجروی کا رنگ غالب ہے ظاہر ہے۔ بیچارہ باغی خود کبھی اپنی بغاوت سے فائدہ نہیں اُٹھاتا بلکہ اس کے بعد کی

نسلیں اس کی بغاوت سے متمتع ہوتی ہیں، خدا کرے ایسا ہو لیکن ستم تو یہ ہے کہ یہ باغی خود اپنا کوئی سرمایہ نہیں رکھتے۔ بلکہ قدیم دور استبداد کے خلاف جن بہادر مشروطہ خواہوں نے کامیاب جہاد کیا ہے انہیں اسلحہ کا غلط استعمال یا ان کی کورانہ تقلید ان کا کارنامہ ہے جس طرح ترک موالات کے دور آخر میں جہلا کا ایک طبقہ "گاندھی جی کی جے" لگا کر ڈاکہ زنی کو جہاد حریت اور سوراج کو مہابھارت سمجھتا تھا ٹھیک اسی طرح حالی، اکبر اور اقبال کا نام لے کر آج کل کے منچلے ہر صدائے بے ہنگام کو جدت طرازی سمجھتے ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو اصلاح کے جوش میں ؎

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

کا نعرہ لگا کر ساحل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے تو کشتی خدا پہ چھوڑ دی ہے دیکھئے خدا اسے کس پر چھوڑتا ہے

نفیس ترین لٹریچر

سیاسی

ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ ۔	سید عبدالباری ایم اے	تین روپیہ بارہ آنہ
ہندوستان کی سیاسی الجھنیں ۔	زیر طبع رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم	دو روپیہ بارہ آنہ
اچھوت اور ہندوستان ۔	علامہ عبدالقدوس ہاشمی	دو روپیہ بارہ آنہ
تصورات پاکستان ۔	قائد اعظم محمد علی جناح	دو روپیہ بارہ آنہ
تشریحات پاکستان ۔	علامہ عبدالقدوس ہاشمی	دو روپیہ چودہ آنہ
معاشیات پاکستان ۔	علامہ عبدالقدوس ہاشمی	ایک روپیہ دس آنہ
ہمارا پاکستان ۔	علامہ شبیر احمد عثمانی	بارہ آنہ
پاکستان مخالفین کی نظر میں ۔	مولوی حسن ندوی	ایک روپیہ
اسلام کے سیاسی تصورات	پروفیسر غلام دستگیر رشید ایم اے عثمانیہ	دو روپیہ بارہ آنہ
حکومت الٰہیہ	رئیس احمد جعفری	دو روپیہ بارہ آنہ
اسلام کا نظام حیات	عبدالوہاب ظہوری	چار روپیہ چار آنہ

کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں (افسانے)	ابراہیم جلیس	دو روپیہ بارہ آنہ
مظلوم دوشیزہ - جون آف آرک فرانسیسی دوشیزہ کے نہایت دردناک حالات -	مترجمہ برزوجی فیروزشاہ تاراپور والا	تین روپیہ
چالیس کروڑ بھکاری (افسانے)	ابراہیم جلیس	دو روپیہ بارہ آنہ
ٹکوناوالیس (افسانے)	ابراہیم جلیس	دو روپیہ بارہ آنہ
بھوکا ہے بنگال (افسانے)	مرتبہ ابراہیم جلیس	دو روپیہ چودہ آنہ
آج کل کے رومان	(خواتین کے افسانے)	دو روپیہ بارہ آنہ
سرنوشت (افسانے)	مجنوں گورکھپوری	دو روپیہ
نظریں - مظہر افضال (افسانے)		دو روپیہ
ہچکیاں -	صدیقہ بیگم سیوہاروی	تین روپیہ
طوفان - (ناول)	رئیس احمد جعفری	تین روپیہ
غبار - (افسانے)	قیسی رامپوری	دو روپیہ چار آنہ
خطا - (ناول)	قیسی رامپوری	تین روپیہ
کسک - (افسانے)	تسنیم سلیم چھتاری	دو روپیہ بارہ آنہ
فلسفیوں کے خواب -	علامہ ظہوری	دو روپیہ آٹھ آنہ

بچوں کی کتابیں

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ	الطاف شوکت بی اے	۸/
حضرت عمر فاروق رضؓ	"	۸/
لاہور کی یادگاریں	"	۸/
دہلی کی یادگاریں	"	۸/
دونوں جہاں والے	عشرت رحمانی	۸/
اونچے نشان والے	"	۸/
پرستان	"	۸/
جنات کی دنیا	مقبول احمد سیوہاروی	ایک روپیہ چار آنہ
ستارے	نجم افندی	۱۰/

ملنے کا پتہ

محمد اقبال سلیم گاہندری پروپرائٹر نفیس اکیڈمی عابد روڈ حیدرآباد دکن



ldren

tries

vorld

re of

